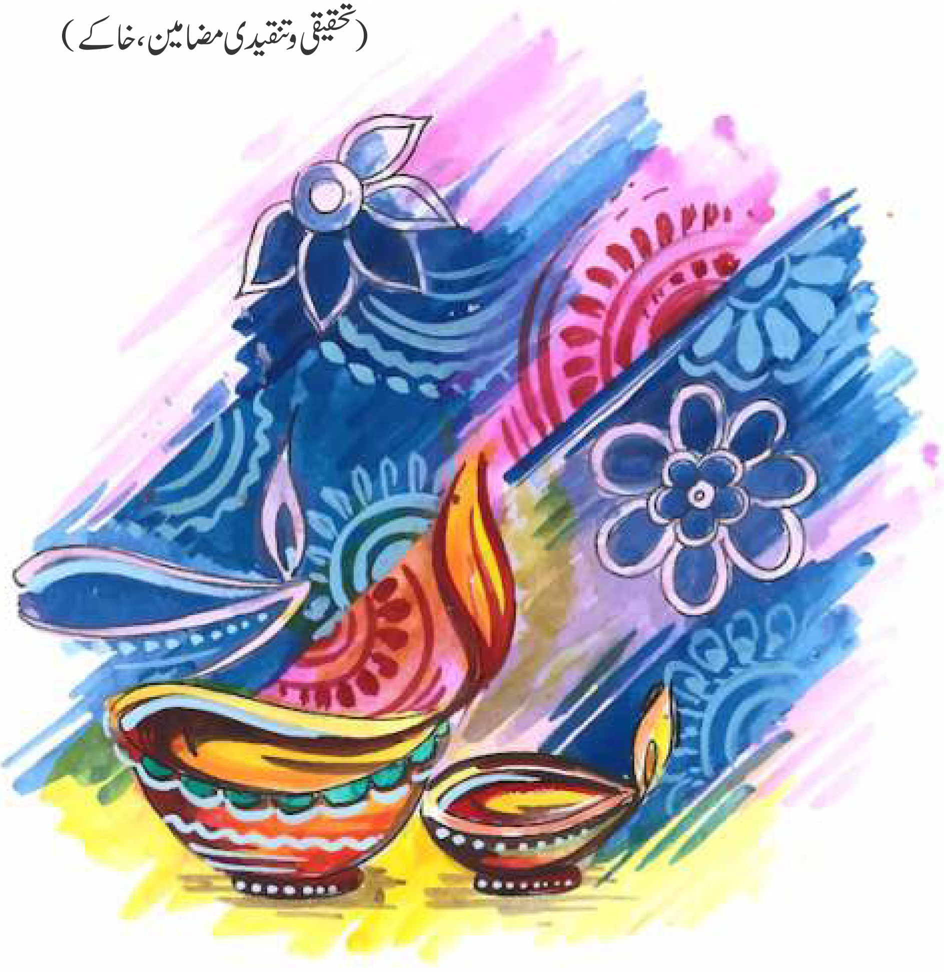
چراغِ فکر

(تحقیقی وتنقیدی مضامین، خاکے)



مصنف:

میاں محمد ارشد حسّان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چراغِ فکر

(تحقیقی و تنقیدی مضامین، خاکے)

مصنف:
میاں محمد ارشد حسان

M ARSLAN PUBLISHERS
ایم۔ارسلان پبلیشرز
ایم۔ارسلان پبلیشرز
ملتان فیصل آباد لاہور
0306-5109344

انتساب

محمد فیاض المعروف اسلامی بھائی

میرے محبوب ﷺ کے محبوب کا عاشق

یعنی

عاشق ابوبکر صدیقؓ

M ARSLAN PUBLISHERS
ایم۔ارسلان پبلیشرز
ملتان - فیصل آباد - لاہور
0306-5109344

کتابیں ہماری
سستی، معیاری

نام کتاب: کرچی کرچی چراغ فکر

شاعر: میاں محمد ارشد حسان

ٹائیٹل: ندیم رومی

کمپوزنگ: محمد رمضان طالب (الہادی فوٹو اسٹیٹ ٹھٹھی شریف، میانوالی)

پبلشرز: ایم۔ ارسلان پبلی کیشنز

طباعت: رضمی پرنٹرز، فیصل آباد

سالِ اشاعت: دسمبر 2022

تعداد: 500

قیمت: 300 روپے

کتاب و صاحبِ کتاب

میاں محمد ارشد صاحب علمی ،ادبی اور مذہبی گھرانے کے فرد فرید ہیں ۔اس اس شعبہ سے وابستہ ہیں جس کے بارے میں پاک پیغمبر نے فریا تھا’’انما بعثت معلما‘‘ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

درس و تدریس سے وابستہ ہیں ،۔لفظ کی قدر و قیمت سے خوب آشنا ہیں ۔ لفظ کو برتنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے ۔مطالعہ ءفطرت و کتب ان کا ہمہ اوقات مشغلہ ہے ۔قدرت نے انہیں زرخیز ذہن عطا کیا ہے۔شعر گوئی سے آغاز کیا ۔حمد و نعت خاص میدان رہا نظم وغزل بھی کہی شاعری میں حسان تخلص کیا ۔بعد نثر گوئی کی جانب آ گئے جو کہ ان کے مزاج سے میل کھاتا ان کا اصل میدان ثابت ہوا۔

میاں ارشد صاحب نے عربی ، فارسی ،انگریزی اور اردو ادب کو صرف پڑھا نہیں سمجھا بھی ہے۔تحقیق و تنقید کے طالب علم ہی نہیں استاد بھی ہیں ۔

’’چراغ فکر‘‘۔۔۔۔۔

’’چراغ فکر‘‘ میں شامل موضوعات میاں محمد ارشد صاحب کی وسعت مطالعہ اور عالمی ادب پر دسترس کی دلیل ہیں ۔ارشد صاحب کسی بھی شخصیت کے فن پاروں کے تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس شخصیت کا اور اس فن کا تحقیقی ،نفسیاتی ،عمرانی اور سماجی و معاشرتی ہر پہلو تفصیلی جائزہ لے کر اس کے معائب محاسن قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے اس شخصیت کے ادبی مقام و مرتبہ کے تعین میں آسانی رہتی ہے ۔

زبان و بیان ، املا و تلفظ ،قواعد اانشا کے معاملے میں انتہائی قدرت کمال رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ''نیلی بار'' چک پیراں کا جسا جیسے ناولوں پراملا،زبان و بیان وغیرہ کے حوالے سے نظر ثانی اور پروف خوانی کا اعزاز انہیں حاصل ہے۔

نثر بہ ذات خود آسان میدان نہیں اور اس انفرادیت کے حوالے کے لیے شکیب جلالی کا ایک خوب صورت شعر ہے۔

شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

ارشد صاحب کے ایسے متعدد مضامین ''چراغ فکر'' کے جیسے مجموعوں کی صورت طباعت واشاعت کے منتظر ہیں۔جنہیں منظر عام پر آنا چاہیے۔اردو ادب کو ایسی فکری مباحث کی حامل تحاریر کی ضررت ہے۔امید واثق ہے کہ ''چراغ فکر'' بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا۔اور یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔

ان شاءاللہ۔

پروفیسر عاصم بخاری
صدر شعبہ اردو،
گورنمنٹ ڈگری کالج کالا باغ

زبان و بیان ، املا و تلفظ ،قواعد انشا کے معاملے میں انتہائی قدرت کمال رکھتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ''نیلی بار'' چک پیراں کا جسا جیسے ناولوں پر املا،زبان و بیان وغیرہ کے حوالے سے نظر ثانی اور پروف خوانی کا اعزاز انہیں حاصل ہے۔

نثر بہ ذات خود آسان میدان نہیں اور اس انفرادیت کے حوالے کے لیے شکیب جلالی کا ایک خوب صورت شعر ہے۔

شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

ارشد صاحب کے ایسے متعدد مضامین ''چراغ فکر'' کے جیسے مجموعوں کی صورت طباعت و اشاعت کے منتظر ہیں۔جنہیں منظر عام پر آنا چاہیے۔اردو ادب کو ایسی فکری مباحث کی حامل تحاریر کی ضررت ہے۔امید واثق ہے کہ ''چراغ فکر'' بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا۔اور یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔
ان شاءاللہ۔

پروفیسر عاصم بخاری
صدر شعبہ اردو،
گورنمنٹ ڈگری کالج کالا باغ

''دِلوں کے طاق میں رکھو چراغِ فکر ونظر''

شہر کے اندھیرے کو اک چراغ کافی ہے
سو چراغ جلتے ہیں اک چراغ جلنے سے

''چراغِ فکر'' کا خالق اس عہد میں لَو بڑھانے کی آرزو لیے ہوئے ''دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر'' کی مثل جستجو میں محوِ سفر دکھائی دیتا ہے۔اس یقین کے ساتھ کہ اک چراغ سے سو چراغ جلتے ہیں۔اس کا ایقان قوی ہے کہ رات بھر اگر چراغِ فکر جلایا جائے۔تو سحر کے رخ کو نکھارا جاسکتا ہے۔''چراغِ فکر'' اردو نثری مضامین کا ایک گلدستہ ہے ۔جس میں ہر پھول کی خوشبو اپنی الگ معنویت لیے ہوئے ہے اوراسلوبیاتی رنگ دلکشی اور جاذبیت رکھتا ہے۔ چراغ فکر کا خالق ادب اور نقد ادب کا ایک حسین امتزاج رکھتا ہے۔میاں ارشد حسان نسلِ نو کے معدودے چند تخلیق کاروں میں سے ہیں؛ جنھوں نے فکروفن کی یکساں بلندی کے ساتھ نثری ادب کی مختلف اصناف میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ اپنی شناخت اورانفرادیت کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ان کی یہ ریاضت مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ جاری رہتی ہےتو وہ یقیناً اس سفر میں منزل پالیں گے۔ان کی نثر معنوی اورفکری وسعتوں کی حامل ہے۔انھوں نے فارسی ،عربی روایت کے ساتھ ساتھ مغربی ادب سے بھی استفادہ کیا، جس کی بدولت ان کی نثر مشرق ومغرب کے سرچشموں سے دانش کشید کرتی دکھائی دیتی

ہے۔یہی امتزاج ان کے استدلال کو مضبوط فکری اساس فراہم کرتا ہے۔

اساتذۂ کرام کے ہاں یہ بات بڑی وضاحت سے ملتی ہے کہ نثر کے وسیلے سے ہم منتخب اور جچے تُلے الفاظ میں کسی تخیئلی پیکر کا سہارا لیے بغیر موزونیت کلام سے بے نیاز ہوکر وضاحت،قطعیت اور منطقی استدلال کے ساتھ اپنے ذہنی عمل کی ترجمانی کرتے ہیں۔جسے عرف عام میں تفکر کہا جاتا ہے۔گویا نثر کی بنیاد فکر پر ہے۔چراغِ فکر کا خالق اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ انتخابِ صنف میں وہ اس بات کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔کہ انھیں کیا کہنا ہے کس اسلوب میں کہنا ہے۔یہ یقین ہی ایک اچھے نثر نگار ادیب کو قلم کاروں کی صف میں جگہ پانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔چراغِ فکر کے تخلیق کار میں یہ اوصاف بہت نمایاں ہیں۔

چراغِ فکر میں ’’ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم‘‘،’’محبتوں کا سفیر‘‘، میں عمدہ خاکہ نگاری کے اوصاف اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔خاکہ نگاری کے اوصاف اور لفظوں میں تصویر دکھانے کا فن تخلیق کار کی قلمی دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اسی طرح مضمون نگاری کے حوالے سے ’فردیات عاصم بخاری‘،’فیض اور وطن‘،’مراقبہ،خواب،جسم مثالی اور تخلیق‘،’سبطِ حسن کے مضمون سیکولرزم کا تنقیدی جائزہ‘،’اردو ادب کے فروغ میں صوفیاے کرام کا کردار‘،’اردو زبان کی ابتدا کے بارے محققین کے نظریات ایک جائزہ‘ ایسی نثری کاوشیں ہیں؛ جن میں چراغِ فکر کے تخلیق کار میں ایک ذمہ دار محقق اور نقاد کی خوبیاں،احساس اور منطقی استدلال ان کی تحقیق اور تجزیہ کو اعتماد عطا کرتا ہے۔اور یہ ان کے طرزِ نگارش کی خوبی ہے۔میاں ارشد حسان نے نثر نگاری میں جس یقین اور خلوص کے ساتھ قدم رکھا ہے۔ان کی مستقل مزاجی ان کے سفر کو اعتبار بخشے گی۔اور وہ فکر کے

چراغ جلاتے رہیں گے۔ بقول سید عاشور کاظمی :

دلوں کے طاق میں رکھو چراغِ فکرو نظر
اندھیرے گھر میں یہی روشنی کی صورت ہے

ڈاکٹر سید ضمیر بخاری
صدر شعبہ اردو،
گورنمنٹ ڈگری کالج فار بوائز، میانوالی

فہرست کتاب

(حصہ اول) تحقیق وتنقید

(حصہ دوم) طنز و مزاح

(حصہ سوم) خاکے

ہندی اردو تنازع۔۔ایک غیر متعصّبانہ مطالعہ

یہ بات میرے جیسے اردو کے ادنیٰ سے طالب علم کے لئے سفا کلیز کی sphinx riddle بنی ہوئی ہے کہ آیا وہ کون سے ایسے حالات تھے کہ چھ سو سال تک ہندو مسلم اتحاد کی نشانی اور مافی الضمیر کا ذریعہ اظہار بننے والی بولی بھلے آپ اسے اردو سے موسوم کریں یا ہندی سے ملقب ٹھہرائیں ، ایک مشترکہ کلچر کی علامت ٹھہری رہنے کے باوجود دو قوموں دو مذاہب اور دو ملکوں کی علیحدگی کا سبب بن گئی۔

دونوں قوموں کے بیانیہ اس قدر مختلف ہیں کہ دونوں دھڑے اوتھیلو بنے اپنے ہی محبوب Desdemona یعنی اردو کو بوسہ دے کر خود ہی ہلاک کرنے پر تلے ہیں۔

فرمان فتح پوری، معین الدین عقیل اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ شدھی سنگھٹن برہموسماج کو اس مناقشہ کا سبب بتاتے ہیں اور ہندو تنظیموں کو بنگال اور بہار میں اردو کی جگہ ہندی اور ناگری لپی نافذ کرنے اور بنارس کے ہندی اوردو تنازع کا ذمہ دار گردانتے ہیں تو گیان چند جین امرت رائے اور امرے بانگا جیسے ہندو ادیب ناسخ و حاتم و مظہر جان جاناں کی اصلاح زبان اردو کو ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی پہلی دانستہ کوشش قرار دیتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ جان بوجھ کر سنسکرت و ہندی الفاظ کو نکال کر عربی و فارسی الفاظ کے دخول سے عرب کلچر ہندوستان پر مسلط کرنے کی مذموم کوشش کی گئی۔

معاملہ دو قوموں تک ہی محدود نہیں الزام یہ بھی ہے کہ divide and rule بینر تلے فرنگی راج نے ہندو مسلم اتحاد کو پاش پاش کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ گل کرائسٹ صاحب کے ذمہ یہ فریضہ بھی لگایا کہ للو لال جیسے براہمن سے ہندو آمیز پریم ساگر لکھوائے اور ادھر پھر خود ہی گریرسن اور فرینک ای سے یہ بھی مشہور کروائے کہ ہندی بولنے والوں کے لئے ایک ایسی زبان کی شدید ضرورت تھی جو ہندوؤں کی زیادہ مطلب برآوری کر سکے اور یہ کہ ہندی زمانہ حال کی پیداوار ہے اور اس کا رواج گزشتہ صدی کے آغاز سے انگریزوں کی زیر سایہ ہوا۔

ادھر اردو ڈیفینس ایسوسی ایشن کے کرتا دھرتا محسن الملک پر اینٹونی میکڈونل صاحب مستعفی ہونے کے لئے یہ کہہ کر دباؤ ڈالیں کہ انکار کی صورت میں علی گڑھ کالج کی معتمدی سے فارغ ہونا پڑے گا تو ادھر سرسید کے علی گڑھ کالج کو donations دی جائیں اور پسر و پدر کو لندن یاترائیں کرائی جائیں۔ ادھر نیشنل کانگریس pro ہندو جماعت کا بانی ہی انگریز اے او ہیوم ٹھہرے ادھر مسلم لیگ کے مطالبات بھی لارڈ منٹو صاحب فراخ دلی سے قبول کئے جاویں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تو میں عرض کر رہا تھا کہ طرف داران اردو اور حامیانِ ہندی اپنی تخلیقات میں جو جانب داری انیسویں اور بیسویں صدی میں دکھاتے نظر آتے ہیں یہ آتش و غالب کی تحریروں میں ناپید تھی۔ غالب میر مہدی مجروح کو مرشدی کہتا ہے تو ہرگوپال تفتہ کو جان غالب بھی پکارتا ہے۔ آتش کی دیا شنکر نسیم سے موانست اپنے بیٹے محمد علی جوش سے کسی طور کم نہیں ہوتی۔ ہوا یوں کہ تحریک آزادی سے کچھ عرصہ قبل اور اس کے

بعد بیسویں صدی کے آغاز میں قومی شعور کی شدید بیداری نے کچھ زیادہ ہی اثر دکھایا اور communal ادب نے جنم لینا شروع کر دیا۔ یہاں میں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بتا تا جاؤں کے ایوب صابر و معین الدین عقیل اور فرمان فتح پوری نے جو زبان اردو کی کرشماتی کیفیتوں میں رطب اللسانی دکھائی ہے ایسے لگتا ہے اردو نہ ہو کوئی ہیلن آف ٹرائے ہو جو دو ملکوں کے مابین جنگ و جدل کا باعث بنی ہو اور جیسا کہ بابائے اردو نے 1961ء میں یوم غالب کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ پاکستان قائد و اقبال نے نہیں اردو نے بنایا ہے، اس طرح کے جملے شاعرانہ اوصاف سے مزین قدامت پسند قلوب کو تو بہلا سکتے ہیں مگر جیتے جاگتے بیدار اذہان اور وہ بھی اکیسویں صدی کے ڈیجیٹل تعقل پسند انسانوں کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا کہ ''کیسے اسی کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا'' یہ تعصب کیسے آیا اس کا ذکر کسی اور موقع پر۔۔۔۔۔مگر یہ کسی نے کسی طور سیاست صحافت اور ادب میں بھی در آیا۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات سے ہندوؤں میں سوائے دیا شنکر نسیم کے کسی کو سیراب نہ کیا اور حالی نے مقدمہ کو کسی ہندو شاعر کے شعر سے اپوتر نہیں کیا۔ اور حد تو یہ کہ یہی بھلا مانس شاعر (فراق کو بندہ اب کیا کہے) فرہنگ آصفیہ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اردو کا لغت لکھنے کا اہل وہ شخص ہے جو دلی کا باسی ہو اور شریف مسلمان ہو۔۔۔۔والعیاذ باللہ

جیسے یوسفی نے غبار خاطر کی نثر پر کہا تھا کہ ابوالکلام نے شعروں میں نثر فٹ کر دی جو یونس بٹ کے ارشاد کی روشنی میں مس فٹ ہی ہے ویسے ہی معین الدین عقیل صاحب اور فرمان فتح پوری صاحب نے کھینچ تان کے تحریک پاکستان تک کے دو قومی

نظریہ کے سفر کو بس

فل ان دا بلینکس کیا ہے۔

پتہ نہیں کیسے مجدد الف ثانی، تیتو میر دودو میاں، سید احمد بریلوی وغیرہ سے اردو کا ناتا جوڑ جاڑ کر دور از کار حوالا جاتی ایکسر سائز کرائی ہے۔ ان بے چاروں سے تو تا عمر سہواً ہی کوئی اردو جملہ سرزد نہ ہوا۔ خیر اس سلسلے میں فریقین کے اعتراضات سے کم از کم یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان بعد و کا سبب بننے والی ابتدائی غلطی کا ارتکاب مسلمان شعرا حاتم و ناسخ نے ہی کیا۔ زبان کو پوتر کرنے کی اس کوشش سے فی الحقیقت اردو زبان و ادب محدود ہو کر رہ گیا۔ اور اس کا اعتراف کھلے بندوں شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نقاد نے بھی کیا ہے۔ تاہم امرت رائے جیسے ہندو نقاد نے تو رائی کا پہاڑ ہی بنا دیا اور تقسیم ہند کی ذمہ داری ہی اردو کے کھاتے میں ڈال دی۔

میں یہاں بغیر کسی لگی لپٹی کے عرض کروں گا کہ فریقین نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اس میں مسلمان ادیبوں کے مقابلے میں ہندو ادباء نے اپنی تحریروں میں وہ زہر افشانی کی ہے کہ اگر زیب قرطاس کروں تو کاغذ جل اٹھے۔ اگر فرض کریں ان کا مئوقف ٹھیک بھی تھا تو ان کی پیش کاری بالکل درست نہیں تھی۔ آپ امرت رائے اور گیان چند جین کی کتب بالترتیب A House Divided اور ایک بھاشا دو لکھاوٹ ہی ملاحظہ کریں تو آپ کو تیر و تفنگ مسلمانوں کا سینہ چھلنی کرتے نظر آئیں گے۔

امرت رائے سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر گیان چند جین جیسا اردو ادب کا صف اول کا نقاد مئورخ اور محقق جس نے ساری عمر اردو کے رزق پر گزاری جب ایک بھاشا دو لکھاوٹ لکھنے بیٹھا اور وہ بھی عمر کے اس حصے میں جب وہ MSA جیسی

لاعلاج بیماری کا شکار تھے تو اپنی اس تصنیف سے اپنی ساری تخلیقات کو بھی بیمار زدہ کر گئے۔ گیان چند صاحب کا سارا گیان اس وقت بدگمان ہو گیا جب انہوں نے اردو کو ہندی سے کم تر قرار دیا۔ ہندی کی زمانی فوقیت بزعم خویش ثابت کرنے کے لئے اپنی تصنیف کے نام کو ہی بھونڈہ تعصب زدہ بنا ڈالا۔ اردو کے اس ثقہ ادیب بقول مرزا خلیل احمد بیگ وسیع ذخیرہ الفاظ میں زبان کے لئے بھاشا اور رسم الخط کے بجائے لکھاوٹ جیسا غیر فصیح لفظ ہی ملا تھا۔ ویسے کتاب کا نام بھی کرسٹوفر آر کنگ کی کتاب one language two scripts سے مستعار ہی لینا تھا تو اس فرنگی سے کچھ ادبیت ہی ادھار مانگ لی ہوتی۔ خیر اس کتاب میں انہوں نے سر سیّد کو ہندو کش، اقبال کو ہندو بیزار، مالک رام کو ڈرپوک، جگن ناتھ کو پاکستان کا نمائندہ، مولوی عبدالحق کو ہندو مسلم اتحاد کا دشمن ٹھہرایا تو خیر تھی۔ حد تو یہ کہ میر، داغ اور محمد حسین آزاد جیسے ادیبوں کی اردو دانی پر بھی بے جا تنقید کی اور مومن، داغ و جگر و اصغر کی کردار کشی سے بھی باز نہ آئے۔ اور تو اور اردو کو کھڑی بولی ماننے سے انکا کر دیا۔ پاکستان کے سکولی نصاب کے لئے لکھا کہ یہ نصاب افغانی طالبان نے تیار کیا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام پر جگن ناتھ آزاد نظم لکھے تو معتوب ٹھہرے اور تسلیمہ نسرین مندروں کے منہدم ہونے پر لجا ناول تخلیق کرے تو وہ ان کی ممدوح ---- یہ ہوتی ہے--- academic discourse

زیب داستان کے لئے بڑھا چڑھا کے مسالے لگا کر دونوں طرف کے لکھاریوں نے کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں کہ ہونٹ کھولیں تو زخم کھلتے ہیں۔ ایک خالص علمی اور لسانی مسئلہ کو جذباتی اور غیر معتدل انداز میں غیر معقول دلائل دے

کر کیسے اٹامک ڈویژن کی جاتی ہے آئن سٹائن کی تو روح بھی کانپ اٹھے۔۔

اب آگے اس میں تمہارا بھی نام آئے گا

جو حکم ہو تو یہیں چھوڑ دوں فسانے کو

کے مصداق قصہ مختصر اس بحث میں پڑ کر ملنا کیا ہے کہ ہندی و اردو میں سے کسے تقدم زمانی حاصل ہے اور زبان بھی لوگوں کے دلوں کو تقسیم کرتی ہے بلکہ ملکوں کو تقسیم کراتی ہے۔ حاشا و کلا

دونوں زبانیں جو بولیوں کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں بھلے ہندی اودھی راجھستانی گجری کے روپ میں یا اردو پنجابی کے بہروپ میں۔۔ ان کو نکھارا اور سنوارا مسلمان و ہندو دونوں نے ہے۔ البتہ دستیاب اردو علمی و ادبی اردو ذخیرہ میں مسلمانوں کا حصہ بہر حال ہندوؤں سے زیادہ ہے۔

تحریک پاکستان میں اردو کا کردار

اردو ہزار قافلہ چہروں کی گرد ہے
اردو نوائے گل کی طرح رہ نورد ہے
اردو لسانیات کی دنیا میں فرد ہے
اردو ولی ہے میر ہے سودا ہے درد ہے
اردو نہاد ذوق ہے غالب اساس ہے
اردو زبان آتش و ناسخ کی پیاس ہے
اردو کے چاند کے ہیں اجالے کرن کرن
مہکے ہیں اس کے عنبریں گیسو شکن شکن
اب کا نہیں یہ ساتھ یہ صدیوں کا ساتھ ہے
تشکیل ارض پاک میں اردو کا ہاتھ ہے

قائداعظم کے بقول تو پاکستان اسی روز بن گیا تھا جب پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا مگر تشکیل پاکستان کا سلسلہ خاصا طویل ثابت ہوا ہے۔ گرمئی احرار مجدد الف ثانی اولین خبرداروں میں یوں نمایاں ہوئے کہ دین اکبری کا قلع قمع ان کے مکتوبات نے کر ڈالا۔ شاہ ولی اللہ کے احیاء دین کی تحریک ان کے خانوادے نے آگے بڑھائی اور تصانیف علمیہ کا گراں قدر اثاثہ ملت اسلامیہ کو ہدیہ کر دیا۔ فرائضی تحریک، سید احمد بریلوی کی جہادی کاوشیں جاں فروشی کی داستانیں رقم کر چکیں تو بریلوی اور دیو بندی مدارس اردو کتب خانوں کو نت نئی شاعرانہ، مذہبی اور متصوفانہ کتب سے لبریز

کرتے رہے۔

تحریک علی گڑھ کے روحِ رواں سر سید ہی وہ پہلے مدبر اور دور اندیش شخص تھے جس نے کانگریس کی سب سے پہلے مخالفت کی۔علی گڑھ مذہبی سے زیادہ تہذیبی اور تعلیمی تحریک تھی۔سر سید احمد کے دست راست اور اردو کے بے مثال ادیب محسن الملک مسلم لیگ کے پہلے جوائنٹ سیکریٹری بنے اور مسلم لیگ کے افتتاحی اجلاس میں خطبہءصدارت دینے والا یہ مرد مجاہد تہذیب الاخلاق کے صفحات پر اردو مضامین کی صورتحال میں جو ہر علمی بکھیر چکا تھا۔

سر سید کے ہی قریبی ساتھی اور اردو زبان میں کتب کثیرہ تصنیف کرنے والے عماد الملک نے ہی لارڈ منٹو کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات کا مسودہ تیار کیا تھا۔شبلی کے المامون والفاروق اور حالی کی یادگار غالب حیات جاوید دراصل فکری سطح پر مسلمانوں کو own کرنے کی عالمانہ کاوشیں تھیں۔اسلامی تہذیبی پس منظر میں تخلیق کردہ عبدالحلیم شرر کے ناول مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے اساسی حوالے ہیں۔بیسویں صدی کے ابتدائی چند عشروں کا معاشرتی سیاسی اور مذہبی کام سارے کا سارا اردو زبان میں ہی تخلیق ہوتا رہا اور قبول عام کی سند پاتا رہا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو زبان اور اس سے وابستہ ادبا شعرا اور صحافیوں نے بے مثال خدمات سرانجام دیں۔اردو ہی وہ واحد زبان تھی جس نے تحریک آزادی میں روح پھونکے رکھی۔اس دور کے اردو شعرا انقلابی شاعری کے ذریعے،صحافیوں نے اپنے زور قلم سے،ادیبوں نے اپنی تخلیقات کے وسیلے سے،اور سیاسی رہنماوں نے اپنے پر جوش خطابوں سے اردو ہی کو وسیلہ اظہار بناتے ہوئے

تحریک آزادی کو گرمائے رکھا۔

حب وطن میں نغمہ سرا شعرائے اردو کبھی "انقلاب زندہ باد" تو کبھی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے سر بکھیرتے رہے۔ حد تو یہ ہے کہ بھگت سنگھ جیسا ہمارا غیرت وحمیت کا استعار پھانسی کے پھندا پر منصور حلاج بنا بسمل عظیم آبادی کا یہ شعر گنگناتا موت کو گلے لگاتا ہے:

سر فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تحریک عدم تعاون میں حسرت موہانی و مجاز لکھنوی کی وطن پرست انقلاب آفریں شاعری ہو یا آزادی و وطنیت کا درس دیتے سوز وطن وانگارے کے افسانے، تحریک علی گڑھ ہو یا ترقی پسند تحریک یا حلقہ احباب ذوق، محمد علی جوہر کا ہمدرد ہو، عبدالقادر کا مخزن، ظفر علی خان کا زمیندار، ابولکلام آزاد کا ہلال یا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ، آزادی کے نظریات کی وکالت زبان اردو نے ہی کی اور خوب کی۔

جہاں کیف بنارسی کا "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح،" نغمے بکھیرتا ہر تقریب آزادی میں قلوب کو گرما رہا تھا وہیں اصغر سودائی کا "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" ہر دل مسلم کی آواز بنا ایک مرکز پر اکٹھا کیے جا رہا تھا۔

زبان اردو کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1867 کا اردو ہندی تنازعہ جہاں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے حصول کی خشت اول قرار پایا وہیں یہی لسانی تنازعہ 1971 میں بنگلہ دیش کی علیحدگی کی بڑی وجہ رہا۔

اس حقیقت سے کسی کو مفر نہیں کہ تشکیل پاکستان میں مذہب اور زبان اردو دو بڑے

عوامل و محرکات رہے ہیں۔ڈاکٹر فاطمہ حسن نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"پاکستان کی بنیاد میں زبان اردو شامل رہی ہے ۔ پاکستان دوقومی نظریہ کی پیداوار کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا. پہلا حوالہ سرسید اور دوسرا علامہ اقبال کا ہے۔"

ہندوستان کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے لیے انگریزوں نے سب سے پہلی حرکت یہ کی ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت کی احیاء کا ڈھونگ رچایا اور ایشیا ٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں لائے پھر ڈیوائڈ اینڈ رول پالیسی کے جھنڈے تلے گلکرسٹ صاحب نے للولال کوی کو سنسکرت آمیز تخلیق پر اکسا کر "پریم ساگر" مرتب کروائی.

پھر جب انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر سازش کی اور اردو کی حیثیت ختم کرنے کی کوشش کی تو نتیجتاً یہ سلسلہ اردو ڈیفنس سوسائٹی، انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ کے قیام سے ہوتا ہوا تشکیل پاکستان پر منتج ہوا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے الفاظ میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ:

"جو معاملہ اپنی زبان کے تحفظ سے مسلمانوں نے شروع کیا تھا وہ مملکت خداداد پاکستان کی صورت اختتام پذیر ہوا۔"

آل انڈیا مسلم لیگ کی چار دہائیوں پر مشتمل کوششوں کا ثمر بصورت پاکستان بجا مگر اس مساعی میں لیگ کی کارروائیاں و پروگرام زبان اردو کی ترتیب پاتے رہے۔

جو سبق حالی کی مدو جزر اسلام سے شروع ہوا، اقبال کی مسجد قرطبہ سے ہوتا ہوا فیض کی صبح آزادی پر منتج ہوا مگر اس میں مہیج و تحرک کا وسیلہ زبان اردو ہی رہی ۔

فرنگی راج تک اپنا مدعا پہنچانے کے لیے زبان غیر کا سہارا لیا جاتا تھا تاہم عوام الناس تک مافی الضمیر اپنی زبان میں ہی پہنچتا رہا۔

قرارداد لاہور پیش ضرور انگریزی زبان میں کی گئی تاہم موقع پر ہی موجود ظفر علی خان نے فی البدیہ اردو روپ دے کر زمیندار کی صفحوں کی زینت بنا ڈالا۔ ویسے بات یہ بھی قابل غور ہے کہ لاہور جلسہ کے سٹیج پر اقبال کا یہ شعر بزبان اردو ہی درج تھا۔

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

معین الدین عقیل کی بات بجا کہ

"ہندوؤں کی معاندانہ تحریکوں کے نتیجے میں مسلمان اپنی تہذیب اور مذہب کے تحفظ کی بابت سوچنے پر مجبور ہوئے۔"

لیکن محمد احمد کی یہ بات میرے بیانیے کو مضبوط کر رہی ہے:

"Urdu was a vital and basic reference for two nation theory"

سبط حسن کے مضمون سیکولرزم کا تنقیدی جائزہ

سید سبط حسن صاحب نے اس مضمون میں لفظ "سیکولرزم" کی تعریف سے لے کر اس کے اصطلاحی مفاہیم تک، توڑ مروڑ کے سارے حربے استعمال کر کے اپنے موقف کی حقانیت کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جو تحقیقی تنقیدی اور ادبی معیارات کے سراسر منافی ہے۔ وہ اسی مضمون میں سیاسی لیڈروں، ملاؤں اور اخبارات کے مدیران کو حدف تنقید بناتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ دروغ گوئی غلط بیانی اور حقائق کو مسخ کر کے اپنے چھپے ہوئے اہداف حاصل کرتے ہیں۔ مگر وہ خود انہی طریقوں کو استعمال کر کے جب اپنے مقاصد کے حصّول کے لیے سعئ لاحاصل کرتے ہوئے بینا قاری پر آشکار ہوتے ہیں تو ان کے تحقیقی مزاج کی قلعی کھل جاتی ہے۔

تعارفی وتمہیدی پیراگراف کے بعد وہ رقمطراز ہیں۔

"آج سیکولرزم سے مراد ریاستی سیاست کی مذہب یا کلیسا سے علحید گی ہے۔"

اور آگے چل کر اپنے موقف کی تائید میں جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ بالکل غیر معقول غیر متعلقہ اور بے جوڑ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کوئی انوکھا فلسفہ نہیں (جس کے داعی سیکولرزم سوچ کے حامل مفکرین ہیں) بلکہ ہمارے صوفیا بھی یہی کہتے ہیں کہ سچائی کو خود تلاش کرو۔۔۔۔اور آگے چل کر اس موقف کی دلیل رابعہ بصریہؒ سے منسوب ایک من گھڑت واقعہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز وہ

بصرے کی سڑک پر سے گزر رہی تھیں اس حال میں کہ ان کے ایک ہاتھ میں مشعل تھی اور دوسرے میں پانی کی صراحی ۔۔۔لوگوں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں جنت کو آگ لگانے اور دوزخ کو بجھانے جارہی ہوں تا کہ لوگ جزاوسزا کی فکر سے آزاد ہو کر خدا سے بے لوث محبت کرنا سیکھیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں سچائی کی خود تلاش سے کیا علاقہ ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ کسی مستند تذکرہ تک میں اس کا ذکر نہیں۔تذکرۃ الاولیا و رسالہ قشیر یہ کشف المحجوب اور عوارف المعارف وغیرہ جیسے تذکروں میں ویسی کسی بات کا ذکر نہیں۔بعض لوگوں نے تذکرۃ الاولیا از فرید الدین عطار سے غلط منسوب کر دیا حالاں کہ نا اصل فارسی نسخہ میں ایسا کچھ ہے نہ A J ARBERRY کہ انگریزی ترجمہ میں ایسی کسی واقعہ کا بیان ہے۔اور جہاں کہیں غیر معروف اور غیر مستند کتب میں اس واقعہ کا ذکر ہے بھی تو پورا واقعہ یہ ہے کہ انہیں راستے میں حضرت حسن بصری مل گئے اور انہوں نے فرمایا آپ کو کارسازِ عالم کے کاموں میں دخل ہونے کا کس نے حق دیا۔چناچہ انہوں نے آگ پانی کو پھینک دیا(تشریحات دیوانِ غالب 261) لیکن چونکہ پورا واقعہ بیان کرنے سے سبط صاحب کا تھیسز بیل منڈھے نہ چڑھتا۔قارئین میں سے کتنے احباب نے یہی واقعہ شیخ سعدی وحسنِ بصری وغیرہ حتیٰ کہ بابا فرید تک سے منسوب کم علم خطباء کے خطبات عالیہ اور تحقیق سے نا بلد ہوائیاں اڑانے والے مصنفین کی تصنیفات میں سنا پڑا ہوگا۔یہ انتہائی لغو و من گھڑت بات اگر کہیں ہو بھی تو الحاقی ہوگی۔جس خدا نے جنت و جہنم کو قرآن میں جا بجا بیان کیا ہے اس کے اولیاء یوں اس کے انعام و سزا کا مذاق اڑائیں گے اور وہ رہیں گے بھی ولی حاشا وکلا!

ویسے سبط صاحب نے کیا دلیل پکڑی ہے سبط حسن تو جنات و معجزات جو نص قطعی سے ثابت ہیں ان کا انکار تتبع سر سید میں اس بنیاد پر کر دیتے ہیں چوں کہ ان کو مشاہدہ و تجربہ سے پرکھا نہیں جا سکتا تو تصوف کی آڑ میں پناہ لینے کی ان کو سوجھی تو کیوں کر؟

اب آجاتے ہیں سیکولرزم پہ۔۔۔جیکب ہولیک سے 1832 میں شروع ہونے والی تحریک جو بقول ان کے مذہب سے کوئی بیر نہیں رکھتی (ملاحظہ ہو نوید فکر صفحہ 71)...آر این کریوہنٹ کے مطابق تشکیک ذہنی پراگندگی و بے عقیدگی کو جنم دے کر اشتراکیت و فسطائیت جیسی تحریکوں کو جنم دے چکی ہے۔۔(تھیوری اینڈ پریکٹس آف کمیونزم، نوید فکر ص۔6)...اے کاش کوئی ان کی لحد پر جا کر بتا آتا کہ جو انہوں نے کہا تھا کہ یہ فلسفہ حیات ہے آج لبرزم (سیکولرزم کی آف شوٹ) کا دعویدار دی اکانومسٹ کہتا ہے یہ کبھی فلسفہ تھا مگر آج یہ وسیع تر عقیدہ بن چکا ہے۔

سبط حسن صاحب نے اپنی کتاب نوید فکر کے صفحہ 71 پر دو اور بھی مثالیں دیں جن میں سے ایک مثال حضرت ابراہیم کی دی کے اگر انہوں نے عقل سے کام نہ لیا ہوتا تو آبا پرستی کا شیوہ اختیار کرتے تو آبائی مذہب پر قائم رہتے اور عقلی دلائل سے رد نہ کرتے تو دین ابراہیمی کہاں ہوتا۔ اول تو یہ بات درست نہیں کیوں کہ انبیا و رسل ربانی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں لہذا نعوذ باللہ ایسا کچھ سوچنا بھی کفر ہے۔۔۔دوسرا یہ کہ انہی حضرت ابراہیم کا پرندوں کے گوشت کے ٹکڑوں سے دوبارہ ان کو اصلی حالت میں زندہ کرنے کا معجزہ بھی اسی قرآن میں بیان ہوا ہے۔۔۔تو وہاں معجزات کی عقلی تشریحات کی نوبت کیوں آجاتی ہے۔۔۔

سبط حسن صاحب تو اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ سیکولرزم کی بنیاد اس نظریے پر قائم ہے کہ ضمیر و فکر اور آزادی رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔۔۔کیا اسی حق کو استعمال کرتے ہوئے یورپ پیغمبر اسلام کے کبھی توہین آمیز خاکے بناتا ہے اور کبھی قرآن کو جلاتا ہے۔۔۔اور جہاں ہولوکاسٹ کا ذکر بھی جرم ہے۔۔۔کیا فرانس و برطانیہ امریکہ سے لے کر روس تک کوئی بھی ایسا ملک ہے جہاں یہ دوہرے معیار نہ ہوں۔۔۔نیوزی لینڈ کی کراسٹ چرچ مسجد میں فائرنگ سب کے سامنے ہے۔۔۔

انہوں نے اگلی مثال غالب کہ دی جو خضر کی پیروی کو بھی قبول نہیں کرتے۔۔۔کیا یہ تحقیقی و ادبی و علمی ڈسکورس کہی جا سکتی ہے۔

آپ نے لکھا کے برصغیر 1498 کی وہ ساعت کبھی نہیں بھولے گی جب پرتگالی جہاز رانوں نے ملابار پر لنگر ڈالے۔۔۔کیوں اس لیے نہیں بھولے گی کہ پھر مسلمانوں کے راج کے خاتمے کے لیے خشتِ اول یہی ساعت بنی۔۔۔جیسے تیسے تھے، تھے تو ان میں سے اکثر مسلمان۔۔(اکبر و دارا شکوہ جیسے سیکولرسٹ کو چھوڑ کر) ان کی تضاد بیانی کا کیا کیجیے جو اس ساعت کے بعد جو صور پھونکا گیا اس پہ پھر وہ خود بھی صفحہ 130، 140 پر ماتم کناں ہیں۔۔۔(کمپنی کی سیکولر پالیسی مخلصانہ نہ تھی بلکہ سیاسی مصلحتوں پر مبنی تھی۔نوید فکر ص 130)۔۔انہوں نے صفحہ 96 پر اقبال و آزاد اور ابراہیم شناسی و نامق رضا کو پتہ نہیں کس بنیاد میں ایک سا قرار دیا ہے۔۔۔وہ ابوالکلام آزاد جس کو سیکڑوں ہزاروں اشعار یاد تھے لیکن کبھی بھول کر بھی اقبال کا شعر ان کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا ایک کانگریسی دوسرا لیگی ان دو اصحاب کی اتنے 'بعد کے بعد بھی مماثلت ان کے قلم کا ہی اعجاز ہے۔۔۔اور شناسی و نامق۔۔۔خدا کی پناہ! مذہب

سے عاری اور حضرت صاحب مراد صاحب تفسیر القرآن بنام ترجمان القرآن۔۔۔آزاد صاحب۔۔۔جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

انہوں نے صفحہ 108 پر ضیا گوکلپ کے حوالے سے لکھا کے امت وملت کے تصور کو گڈ مڈ نہیں کرچاہیے کیونکہ امت بین الاقوامی جمیعت ہے جب کہ ملت کی بنیاد وطن ہے۔۔۔مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کے وہ ملت کے جس بھی تصور کے حامی وداعی رہوں۔۔۔مگر اعتراض تو یہ کہ ان کا جب جی چاہتا ہے وہ اقبال کی کوئی بات جو ان کے موقف کی تقویت کا باعث بن رہی ہوتی ہے۔۔۔بیان فرما دیتے ہیں۔۔۔ اور طریقہ یہ ہوتا ہے کہ حوالہ دینے کے بجائے کانٹ چھانٹ سے اپنا باغیچہ سرسبز بنا لیتے ہیں۔جیسا کہ انہوں نے۔۔۔صفحہ 158 پر لکھا تھا کہ تحریک پاکستان سیکولر تحریک تھی اور خطبہ الہ آباد کو کوٹ کرتے ہوئے لکھا۔

''جہاں تک مسلم ذہن میں پڑھ سکا ہوں مجھ کو یہ اعلان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی ۔۔۔کہ ہندوؤں کو یہ ڈر نہ ہونا چاہیے کہ ان خودمختار مسلم ریاستوں کے معنی ان میں سے کسی قسم کی مذہبی حکومت کے قیام کے ہوں گے''۔۔۔ اچھا اس خطبہ پر میں بعد میں آتا ہوں پہلے امت وملت کے فرق پر آجاتے ہیں۔۔۔ جس کا مفہوم آپ پر گلوکلپ صاحب نے کھولا ہے۔۔۔ان کے ممدوح اقبال کیا ملت وامت کے اسی فرق کے حامی تھے۔ویسے انہوں نے سید نذیر نیازی کی اقبال کے حضور تو پڑھی ہوگی ۔۔۔اقبال وحسین احمد مدنی کی (احسان لاہور) میں ابحاث بھی پڑھی ہوں گے اقبال کے یہ اشعار تو ضرور پڑھے ہی ہوں۔۔۔جو حسین احمد مدنی کے ان الفاظ (قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے) کے جواب میں بطور اشعار

پیش کیے گئے۔

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرور برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفی برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

(صاحبان علم ودانش وضاحت کے لیے پڑھ لیں اقبال کا مقالہ ''اسلام اور قومیت''

۔۔مطبوعہ احسان لاہور 1937)

اب آجاتے ہیں خطبہ الہ آباد پر۔۔۔انہوں نے تحریک پاکستان کی جن سیکولر بنیادوں کی نشاندہی فرمائی۔۔۔اور ذرا ملاحظہ فرمائیں وہ سیکولر بنیادیں۔۔ اقبال کے اسلام کے حوالے سے اسی خطبہ ٔگلشن میں سے چند مہکتے پھول۔۔۔

* اسلام نے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔۔۔
* اسلام نے وحدت آدم پیدا کرنے کا سب سے بہتر کردار ادا کیا ہے۔۔۔
* اسلام بحثیت ایک معاشرے کے اسی روح ثقافت سے سرشار ہے جسے ایک خاص اخلاقی تصور حیات سے فیضان ہوتا ہے۔
* میں دنیائے اسلام کے فعال اور زندہ قوت ہونے کی طرف سے قطعی مایوس نہیں۔
* اسلام خود ایک تقدیر محکم ہے۔

* حضور اکرم کے واردات مذہب جو قرآن سے ظاہر ہیں انفرادی واردات تو ہیں مگر اجتماعی نظامات کو بھی تخلیق کرتے ہیں۔۔
* اسلام کا نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے الگ نہیں۔۔
* وہ گروہ انسانی جو میرے اوضاع واطوار زیست کا سر چشمہ ہے مجھے اس سے محبت ہے۔ کیوں کہ اسی نے مجھے دین اور فیضان روحی عطا کیا ہے۔۔
* اس لیے مسلمانوں کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک مسلمان ہندوستان ہونا چاہیے۔۔
* مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ کم از کم شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں کو آخرالامر ایک ہندوستانی مسلم ریاست بنانی پڑے گی۔۔۔
* اب اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی روح اس کی ثقافتی قوت کی شکل میں زندہ رہے تو پھر اسے ایک مخصوص علاقے میں مرتکز کرنے کی ضرورت لابدی ہے۔۔۔

یہ چند اقتباسات ہیں کہ ورنہ دفتر دستیاب ہے۔۔۔ پتہ نہیں کیوں سیاق وسباق سے ہٹ کر اور ادھوری بات کر کے اپنے موقف کو منوا کر ہمیں ملتا کیا ہے۔۔۔

سبط حسن صاحب فرماتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے دوران میں اسلام کا نعرہ کبھی نہیں لگا ایک ثانیہ کے لیے مان لیتے ہیں یہ نعرہ نہیں لگا تو کیا وہاں سیکولرزم کے سلوگن بلند کیے گئے تھے؟۔۔۔اس وقت آدھی آبادی تو اس اصطلاح سے بھی شناسا نہ ھوگی۔۔۔انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کے بانیان نے پاکستان غربت دور کرنے کے لیے بنایا۔۔۔اقبال کے پورے خطبہ میں کوئی لفظ غربت ہی دکھا

دیں۔۔۔۔

سیکولر طبقہ کی روایت پر چلتے ہوئے سبط حسن صاحب بھی بار بار قائداعظم کی 11 اگست والی تقریر کا حوالہ دے کر قائد کو سیکولر ثابت کرنے پہ تلے رہتے ہیں۔۔۔(ملاحظہ نوید فکر 159 تا 161)..اس کے علاوہ اس طبقہ کے پاس ہے ہی کیا؟۔۔۔میں اس تقریر پہ آنے سے پہلے قائد کے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ربع صدی پر محیط سیاسی سفر کا مختصر جائزہ لے کر واضح کروں گا کہ وہ کس قسم کے سیکولر تھے۔۔۔

"The Hindus and the Mussalmans belong to two different religions,philosophies,social customs and literature...They neither intermarry nor interdine and indeed they belong to two diferent civilizations which are based mainly on conflicting ideas and conceptions..(Presidential Address Lahore 1940)......

صرف لفظ انٹر ڈائن اور انٹر میری پر غور فرمالیں۔۔۔کیا کوئی سیکولر سوچ کا بندہ ایسی باتیں سوچ بھی سکتا ہے۔۔۔

Hindus and Muslins, though living in the same towns villages and neighbourhood had never been blended into one nation.

(March 1944)

...We should base our democracy on the principles and concepts of Islam..(February 1942)..

....We did not demand Pakistan simply to have a piece of land but we wanted a laboratory where we could experiment on Islamic principles.. (Islamia College Peshawar)

Pakistan does not mean freedom, but the islamic dieology as well which to be preserved, which has come to us as precious gift and which we hope others will share with us. (18 the June 1945)... On eve of Eid Milad-un-Nabi 1948 said.. I cannot understand a section of people who deliberately want to create mischief and make propaganda that the constitution of Pakistan will not be made on the basis of "shariat"... islamic principles today are as applicable to life as they were 1300 years ago....

طوالت کے خوف سے انہی پہ اکتفا کر رہا ہوں ورنہ ایک کتاب بن سکتی ہے۔۔۔اب آجاتے ہیں 11 اگست کی تقریر پہ۔۔۔قائداعظمؒ نے صرف اس بات کا اعادہ کیا کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کو بھی وہی حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی جو مسلمانوں کو حاصل ہوں گی۔۔۔سبط حسن صاحب نے جو کوٹ کیا کہ مذہب کا کاروبار مملکت سے کوئی نہیں تو میں وہی پیراگراف لکھ دیتا ہوں تا کہ کارئین سیاق وسباق سے واقف ہو جائیں قائداعظمؒ نے جو فرمایا وہ یوں ہے'' آپ کا تعلق کسی بھی مذہب یا ذات سے ہو۔۔اس کا کاروبار مملکت سے کوئی سرکار نہیں۔۔ہم اس بنیادی اصول سے آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک مملکت کے شہری اور مساوی شہری ہیں ۔۔۔میرے خیال میں اب ہمیں اس بات کو بطور نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ دیکھیں گے کہ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی لحاظ سے نہیں کیونکہ وہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ مملکت شہریوں کے طور پر سیاسی لحاظ سے'' ۔۔۔خدا کا خوف کریں ہم لوگ کیا اس سے قائد کو سیکولر بنا دیں گے۔۔۔اور شاید یہ بھی ان کے علم میں ہوگا جی ایم سید نے اس آخری جملہ پہ (جو کسی طور بھی وضاحت طلب نہ تھا) کیا رد عمل دیا تھا اور پھر ڈان اخبار کو کیا وضاحت دینی پڑی تھی۔۔۔۔

سبط حسن صاحب نے صفحہ 153 پر لکھا ''سیکولرزم کا مسلک وہی ہے جو سر سید کا ہے یعنی دینی امور او دنیاوی امور کے تقاضے اور دائرہ کار جدا جدا ہیں لہذا نہ ریاست کو اپنے باشندوں کے مذہبی عقائد میں مداخلت کرنی چاہیے نہ مذہب کو ریاستی اموروں میں دخل دینا چاہیے۔

سید صاحب نے سر سید سند بنا کر 14 صدیوں کے اجماع امت کو ٹھکرا ردیا ۔۔کیا کسی ایک بھی عالم دین نے پچھلی چودہ صدیوں میں یہ بات کی کیا وہ سب اللہ معاف فرمائے جاہل تھے ۔۔۔سر سید کی علمی حیثیت اپنی جگہ مگر کیا ایک شخص کی ذاتی رائے جو سراسر مبنی پر خطا ہو اس کو قبول کر کے ہم 13,14 صدیوں کی مذہبی روایت او دانش اجتماعی کو جھٹلا دیں۔

یہاں پھر ان کے ایک بہت بڑے ممدوح جن کو انہوں نے کتاب میں بیسیوں مقام پر کوٹ کیا ان سے پوچھ لیتے ۔میری مراد اقبال مرحوم ہیں ۔۔۔اقبال فرماتے ہیں ''اسلام وحدت انسانی کو روح کے دو الگ تھلگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا ۔اسلام میں خدا او کائنات روح اور مادہ مذہب وسیاست مین ناخن اور گوشت سا باہمی تعلق ہے (حرف اقبال از لطیف احمد شیروانی)

ایک جگہ وہ کہتے ہیں ''سوشلزم کے معترف ہر جگہ مذہب اور روحانیت کے مخالف ہیں۔وہ مذہب کو افیون تصور کرتے ہیں۔لفظ افیون اس ضمن میں کارل مارکس نے ہی استعمال کیا۔میں مسلمان ہوں اور ان شاء اللہ ''مسلمان مروں گا۔میرے نزدیک تاریخ کی مادی تشریح غلط ہے'' (مکتوب بنام غلام السعدین)

اقبال نے جہاں کارل مارکس کی تعریف کی ہے اس کے بعد اسلام کو بطور زندہ مذہب اور آخری پناہ گاہ کے بیان کیا ہے ۔۔۔مثال کے طور پر آپ ابلیس کی مجلس شوریٰ ہی پڑھ لیں۔ویسے وہ اشعار بھی لائق مطالعہ ہیں جن میں بندوں کو تولنے کی بجائے گننے کا ماتم ہے اور دین کو سیاست سے جدا کرنے کو چنگیزی بھی اسی اقبال لاہوری نے کہا ہے ۔۔۔ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں۔

''یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیش تر'' ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقیدہ کا پابند ہو۔۔ ایسے سیکڑوں حوالے جو پیش کیے جا سکتے ہیں۔۔۔مگر میں اختصار پہ قانع ہوتے ہوئے یہ عرض کروں گا اقبال کی سوچ میں مسلسل ارتقا رہا اور ایسا ہر شاعر و ادیب و فلسفی کے ساتھ ہوتا ہے اپنے دلائل کو مضبوط بنانے کے لیے سیاق وسباق سے ہٹ کر یا دور اولین کے اشعار اور تحریروں کو کوٹ کر کے اپنے پلڑے میں ڈالنا تحقیقی اصولوں کے خلاف ہے ۔۔۔(جیسا ابتدا میں اقبال بھی جب الوطنی کی محدود تصور کے داعی رہے یا ابن عربی پہ دور اولین میں تنقید کی اور بعد میں رجوع کیا)

سبط حسن نے اسی مضمون میں لکھا ہے ''گزشتہ سات سو سال طویل عرصے میں مسلمان حکومتوں کی سرپرستی کے باوجود کسی بزرگ کے قلم سے ایسی ایک طبع زاد تصنیف بھی نکلی جو ہم آج دنیا کے سامنے فخر سے پیش کر سکیں۔۔۔ان کو ابن خلدون کی ہوا تک نہیں لگی۔۔۔کیا عجب انہوں نے ابن خلدون کا نام بھی نہ سنا ہو گا۔

جناب والا پہلی بات یہ ہے کہ آپ کے ممدوح نے صرف مقدمہ ہی نہیں لکھا ۔۔۔تاریخ ابن خلدون پڑھیں آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ ملا خادم حسین رضوی سے زیادہ کٹر تھا۔۔۔دوسری بات جو انہوں نے کہی کہ ان ملاؤں نے ابن خلدون کا نام بھی سنا ہو گا۔اس پر تبصرہ کرنا مجھے لگ تو لغو رہا ہے مگر میں اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ سیرت خاتم الانبیاء از مفتی شفیع عثمانی و سیرت مصطفیٰ عبدالمصطفی اعظمی سے لے کر پیغمبر اعظم و آخر از نصیر احمد ناصر و رحیق المختوم از صفی مبارک پوری تک سارے علماء ابن خلدون کو کوٹ کیا ہے۔اور رہی بات دنیا کو دکھانے والی تو ستاون اٹھاون ملکوں پر مشتمل مسلمان ریاستیں

کیا ان کی دنیا میں نہیں آتیں ۔۔شاہ ولی اللہ و مجدد الف ثانی و شاہ عبدالعزیز دہلوی سے لے کر احمد رضا بریلوی و ڈاکٹر حمید اللہ و مودودی، ڈاکٹر طاہر القادری صاحب تک کی کتابیں عالم اسلام میں بطور حوالہ پیش کی جاتی ہیں ۔۔۔اور اگر ان کی مراد سائنسی تصانیف ہیں تو جن صاحب کا ذکر انہوں نے صفحہ 127 کی سطر 18 پر فرمایا ہے میری مراد شمس العلماء ڈاکٹر ضیا الدین صاحب ہے۔۔۔تو قبلہ یہ صاحب خود ریاضی کے مسئلے کے لیے احمد رضا کے پاس بریلی تشریف لائے ۔۔۔(حیات اعلی حضرت صفحہ 42) یہ احمد رضا وہی شخص ہیں جنہوں نیوٹن کے نظریات کے رد میں سائنسی تصانیف کیں ۔۔۔اور جن کے بارے میں ان کے ممدوح اقبال نے کہا کہ یہ آج کا ابوحنیفہ ہے۔کیا ان کی نظر سے فوز مبین در رد حرکت زمین المو ہبات فل المربعات اور کشف العلہعن سمت القبلہ جیسی کتب نہیں گزریں ۔۔۔یا یہ چوں کہ ملائے مسجدی کے قلم سے نکلیں تو ان کے دل میں جگہ کیسی بناتیں ۔۔۔اس ملا نے نہ صرف ریاضی و سائنسی علوم پر 6 کتب تصنیف فرمائی بلکہ 92 دیگر علوم پر 1300 کتابیں بھی لکھیں ۔۔۔مگر تھا تو ملائے مسجدی نا ان کا ممدوح نہ ٹھہرا۔۔۔36 جلدوں پر مشتمل ان کے فتاوی میں آپ کو ایسے سیکڑوں سائنسی سوالات کے شافی جواب مل گئے ہوتے اگر ذوق نظر نے گوارا کیا ہوتا۔۔۔زمین سے مخروط ظلی اور آنکھ سے مخروط شعاعیں جبکہ سورج سے مخروط نوری پیدا ہوتا ہے ۔۔۔روح انسانی متجزی نہیں ۔۔۔۔رطوبت جب حرارت میں عمل کرے گی تو فائدہ روح کو ہوگا۔۔۔ایسے سیکڑوں سائنسی سوالات اور ان کے جوابات کی فہرست میرے پاس موجود ہے مگر طوالت کے پیش نظر اسی پر اکتفا کر رہا ہوں۔

سبط حسن نے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ (ہمارے مدارس کے نصاب میں الکندی ''الفارابی، ابن سینا، البیرونی اور ابن رشد'' سرے سے غائب ہیں۔

باقی نام تو مجھے غائب ہونے پر ذرا بھی دکھ نہیں کہ ان کی تصنیفات کے سائنسی اہمیت اپنی جگہ مگر علماء کا بنیادی کام بہرحال علم دین کا حصول ہی ہے یا سبط صاحب کی رائے کو اہمیت دیتے ہوئے اگر علماء میں تخصص فی السائنس کا الگ ایک سال شامل نصاب کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ۔۔۔ یہ میں خود تجویز کر رہا ہوں سبط صاحب دلی طور پر ملائے مسجدیوں کو چندوں تک ہی محدود رکھنے کے روادار تھے ۔۔ البتہ سبط صاحب نے ایک نام پتہ نہیں انجانے میں غلط لے لیا ۔۔۔ میری مراد البیرونی سے ہے ۔۔۔ یہ البیرونی وہی ہے جن کوئی مورخ اور ماہرینِ امورِ سیاست دو قومی نظریہ کا بانی سمجھتے ہیں اپنی کتاب " کتاب الہند" میں انہوں نے نہ صرف مسلمانون کی اخوت کا ہندوؤں کے ذات پات کے گھٹیا تصور سے تقابل کر کے مسلمانوں کی افضلیت کو ثابت کیا بلکہ انہوں نے لکھا کہ ہندو مسلمانوں کو ملیچھ مطلب غلیظ ناپاک کہتے ہیں اور مذہبی تعصب کی یہ حد ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کھانا تناول کرنے سے بھاگتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ خود ناپاک ہو جائیں گے ۔۔۔ اسی جانب کرتے ہوئے شمشاد احمد اپنی کتاب پاکستان اینڈ ورلڈ افیرز کے صفحہ 119 پر لکھتے ہیں ۔۔۔

According to al Biruni 'the Hindu looked at Muslims as "the devil's breed' and our doing as the opposite of all that is good and proper". Al

Biruni to many is the real founder of the two nation theory in south Asia.....

المختصر سبط حسن صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کیے نہایت ادب سے میں کہوں گا وہ تضادات کا مجموعہ ہیں سیکولرزم کے حق میں پیش کردہ ان کی معروضات کا صرف سرسری جائزہ لیتے ہوئے میں کہوں گا کہ ان کی تخلیق میں سقم ہیں اور کئی مقامات پر انہوں نے تعصب کی عینک اتارے بغیر اپنے نظریے و نکتہ نظر کی تائید میں ادھورے حوالہ جات اور سیاق سباق سے ہٹ کر عبارات پیش کی ہیں۔ ہمیں کسی بھی شخصیت کے علمی قد و قامت کے رعب میں آئے بغیر اس کے نکتہ نظر کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔

نوم چومسکی ایک عہد ساز علمی شخصیت

دور حاضر کا سب سے بڑا مفکر نوبل انعام یافتہ نوم چومسکی بھلے مذہباً یہودی ٹھہرا مگر اس مرد حق نے ساری عمر صیہونی اور سامراجی پالیسیوں کو مدلل علمی اسلوب میں پوری شرح و بسط کے ساتھ اس طرح رد کیا کہ ہر ہر گوشہ اس نابغہ کی عقبریت سے تاباں نظر آتا ہے۔ پوری صدی پر محیط ہشت پہلو اس تابناک پر عزم کے کس کس پہلو کی بات کی جائے۔ بیک وقت ماہر لسانیات ، مدبر، مفکر،، دانشور، فلسفی ، ماہر امور سیاسیات، ایکٹیوسٹ، سوشل سائنٹسٹ، موٹی ویشنل سپیکر، مئورخ اور کیا نہیں ہیں یہ پروڈیجی۔ ایک صد کتب کے خالق کی خلاقی کی ہر سطر پر ارسطو اور افلاطون کی ارواح اگر تناسخ پا سکتیں تو سات سمندر پار ریڈ انڈین کے دیس کے اس باسی کو نمستے کہنے ضرور حاضر ہوتیں کہ اس اشرف المخلوقاتی جنس نے حقیقی معنوں میں مذہب و نسل و علاقائیت کی حد بندیوں سے ماوراء ہو کر عالمی بھائی چارے اور انسانی بقا کی مساعی پر ہی کمر کسے رکھی۔

افغانستان، عراق، لیبیا، یمن و شام تک ہر امریکی جارحیت کی مذمت عالمانہ ڈسکورس کے باوقار انداز میں کر کے محمد یوں کے اس موسوی بھائی نے اقوام عالم کو یہ پیغام دیا ہے کہ جمیعت اقوام سے جمیعت آدم بہر حال بہتر ہے۔

ابلاغ عامہ سے وابستہ براڈ کاسٹر و صحافی ان کے پروپیگنڈہ ماڈل کی شیدائی ہیں تو لسانی ماہران کے Transformational Generative کے نمک

خوار ہیں تو نفسیات دان ان کے Cognitive تھیوری کے مدح سرا۔سی آئی اے کے covert actions کو بے نقاب کرنے والا یہ مہا گرو تھرڈ ورلڈ مما لک کا مسیحا گردانا جاتا ہے تو گر امیرئین انہیں لسانی آئن سٹائن سمجھتے ہیں۔ایڈورڈ سعید کے بعد یہ وہ دوسرا بڑا نام ہے جس نے امریکی اور مغربی ریاستی اداروں کے دوہرے معیارات کی قلعی کھولی ہے۔غریب و مفلوک الحال مما لک کے استحصال کا احوال اگرچہ المناک سہی مگر ان کا منفرد عالمانہ انداز،انوکھی تراکیب کی چاشنی،اسلوب تحریر کی دل پذیری اور واقعاتی ترتیب قاری کو پرلطف ارفعیت سے مزین کر دیتی ہے۔

فرینکلن ڈی روز ویلٹ کی چہار آزادیاں قابل صد تحسین سہی مگر چومسکی وہ واحد کھوجی ہیں جنہوں نے امریکن پالیسی کی ''پانچویں آزادی'' کے مکروہ چہرے سے نقاب اٹھایا ہے۔

سیموئل ہنٹگٹن جیسے متعصب کرائے کے لکھاری کی Clash of civilization کی لایعنی ابحاث کا علمی رد ہو یا ٹرومین تھیوری کا بطلان اس مردحق شناس نے ڈنکے کی چوٹ پر کر دکھایا۔گنز اینڈ بٹر پالیسی کے معاشی تسامحات سے لے کر ریگن کے فوجی لٹیروں کی چیرہ دستیوں تک اور بش سے ٹرمپ کی کرمنل جنگی حکمت عملی تک امریکی غنڈہ گردی کی اندرونی کہانی اس درویش نے سر محفل سنا ڈالی۔

کوسٹاریکا، ویت نام جاپان،نکاراگوا،سینڈینسٹا یہ سب اس وقت کی لاغر حکومتیں سہی مگر امریکہ مفادات میں سدِ راہ ہوئیں تو مردہ خانے منتقل کر دی گئیں۔ چرچل کے فرمان عالیہ پر مشتمل یورپی استعماری ریاستیں دنیا کی حکمرانی کا فرض،آسودہ قوموں کو ہی سونپنے کی داعی ہیں۔

نظریہ تجاہل بالمقصد کے تحت امریکہ سے پاکستان جیسے معصوم ملکوں کے لئے روانہ کئے گئے بحری امدادی بیڑے کبھی لنگر انداز نہیں ہوتے۔ جنیوا معاہدہ ہو یا پیرس پیکٹ، سینٹو ہو یا سیٹو سب کی دھجیاں امریکہ نے ہی اڑائی ہیں۔ ناگاسا کی ہیروشیما جیسی انسانیت سوز حرکتوں سے اس کا بیسری نامہ اعمال انصاف و مساوات کو منہ چڑا رہا ہے۔ مگر چومسکی کی ان صد کتب کا یہ جریدہ عبرت نوشتہ دیوار بنا اقوام عالم پر واضح کر رہا ہے کہ انہ لکم عدو مبین۔۔۔ مگر پسماندہ عاقبت نا اندیش یہ تیسری دنیا کے ان ممالک کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ ہے کہ تاریخ سے یہ سبق نہیں سیکھتے اور شجر ممنوعہ سے کھانے سے باز نہیں آتے۔

چومسکی نے پانچ سو سالہ امریکی مغربی طاقتوں کے Domination کے پیچھے کارفرما غریب ملکوں کے استحصال کے سارے فارمولے ڈھونڈ نکالے۔۔ مگر ہے کوئی دیدہ عبرت۔۔۔ چومسکی نے ماڈرنزم، نیو ورلڈ آرڈر اور لبرلزم کے نام پر ان نام نہاد انسانیت کے نجات دہندوں کے خبث باطن کو طشت از بام کر دیا ہے۔۔۔ مگر وہی بات کہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہی یہی ہے کہ تاریخ سے کسی نے سبق نہیں سیکھا۔

مراقبہ۔، خواب، جسم مثالی اور تخلیق

آج سے صرف ربع صدی پہلے تک بھی اقوام یورپ بالعموم اور برصغیر کے پڑھے لکھے بالخصوص بابو جن کو گوروں نے Baboon مطلب بندر سے مخفف نکال کر پکارا، تصوف و روحانیت وطریقت اور ان سے متعلقہ اصطلاحات کشف غنود، شہود وغیرہ۔۔ کا سرِ عام نفرت سے مذاق اڑاتے تھے کہ یہ کیا عالم بالا کی ماورائی باتیں کر

رہے ہو صاحب۔ مٹی ہو مٹی سے اپنا رشتہ استوار رکھو گوشت پوست کے انسانوں جدلیات و مادی جدلیات کا شور بر پا ہے تمھیں کیا ہوا!

* آج کی مائنڈ سائنسز ہپناٹزم پیراسائیکالوجی ٹیلی پیتھی، اور پتہ نہیں کیا کیا ان سب کے ڈانڈے تصرف، روحانیت سے جا ملتے ہیں۔ مغرب ان سارے علوم کو بھلے جو نام دیتی پھرے یہ سارے سوتے ابن عربی کی فتوحات مکیہ فصوص الحکم سے ہی پھوٹتے ہیں۔ اقبال ماضی سے رشتہ جوڑے تو ناسٹلجیا کا مریض، اور ٹی ایس ایلیٹ روایت کی بات کرے تو اس کو روا ہے

* فرائڈ کے منہ سے ایگو سپر ایگو نکلے تو بنیادِ علمِ نو رکھ دی ہے اقبال کہے خودی تو ایویں بونگیاں ماریاں نیں (یاد رہے اقبال کی اسرار خودی فرائڈ کی تھیوری سے 8 سال پہلے اور رموز بے خودی 4 سال پہلے منظر عام پر آئی ہیں۔)

نطشے سپر مین کہہ اٹھے تو واہ اور اقبال مرد (مومن) پکارے تو آہ! ویسے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کی ابن عربی کا مرد کامل ان دونوں سے 7 صدیاں پہلے جنم لے چکا تھا

* ویسے مغرب کی Self Actualisation سے صدیوں پہلے معرفت کی اصطلاح ''لسان العرب'' میں ابن منظور درج کر چکا تھا۔

* جس دلائی لامہ، سدھ گرو کے مراقبہ سیشنوں میں اہل مغرب دوڑے چلے آتے ہیں یہ فرید و باھو کے اباؤ اجداد کی ایجاد ہے۔

* آج مغرب کے یہ موٹی ویشنل سپیکر Dave Ulrich اور مارشل کولڈ سمتھ جے پیاسن و کیری کیلر جو انہیں one thing باطن باطن اندر اندر کا درس

دیتے پھرتے ہیں ہمیں یہ درس ہمارے رسول نے ساڑھے چودہ صدیاں پہلے دے دیا تھا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اور سلطان باھو جیسے ہمارے لائف کوچز ہمیں پہلے آگاہ کر گئے:

ایہہ تن رب سچے دا حجرہ وچ پا فقیرا جھاتی ھو
نہ کر منت خواج خضر دی تیرے اندر آب حیاتی ھو

* کل تک روح کے وجود سے انکاری وہی لوگ آج اس کا وزن 500 گرام بتاتے پھرتے ہیں۔

* ان تعقل پرستوں نے وہ فسوں مسلمانوں پر بھی پھونکا کہ سرسید پرویز جیسے عبقری ذہینت والے بھی جادوئے سامری کی سحر میں مبتلا ہو کر معجزات مصطفیٰ کا انکار کرنے لگے اور خود سائنسی کرشمات سے سائنس کو خدا کا متبادل پیش کرنے لگے۔

* حق کور مگر خود کو عبقریت کل کا مالک سمجھنے والے یہ اہل علم کبھی انسان کو معاشرتی حیوان تو کبھی بن مانس کے خطاب سے نوازتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ سرسید کی مدت مدید مریدی نے حالی جیسے بھلے مانس پر بھی مغربی اثر اندازی کا یہ رنگ دکھایا کہ انہوں نے اپنے استاد کو حیوانِ ظریف کہہ کر اپنی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔

* مدتوں ہمیں کج فہم جاہل اور ضعیف الاعتقاد کہنے والے یہ لوگ فیفا کے جھنڈے تلے we belive in Football کا سلوگن لگانے سے بھی نہیں کتراتے پاؤں سے روندی کچلی اور ٹھوکریں کھانے والی ربڑ کی گیند بھی ہمارے عقائد سے اعلیٰ ٹھہری۔ اعوذ اللہ من الشیطنِ الرجیم۔

بقول ڈاکٹر طاہر القادری سیکولرز پہلے 1000 سال عیسائیت کو عضو شل

کرنے پہ تلی رہی اوراب ایک ہزار سال سے اسلام کو کچلنے پہ تلی ہے مگر پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا قصہ کوتاہ نقائصِ تہذیبِ مغرب ان گنت میں لیکن اصل موضوع کی طرف آتے ہیں ۔ یہ تمھید اس لیے ضروری تھی کہ مشرق سے منسوب ہر چیز لغولایعنی اور بے فائدہ نہیں ہوتی ۔ یہ چند سطریں جو میں بیان کرنے لگا ہوں علم و دانش فرنگ سے متاثر ارباب تحقیق آمیز ٹھوکر سے بنا پڑھے سنے ہی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں کہ اہل مشرق کو ابوجہل سمجھنے والے لغزشِ پا میں پابندی آداب سے بھی عاری ہیں ۔

اب آجاتے ہیں اپنے موضوع مراقبہ خواب ،جسم مثالی اور تخلیق کی طرف مراقبہ کیا ہے اس کو پہلے واضح کرتے چلیں ۔

مراقبہ یہ نہیں کہ کوئی شخص آنکھیں بند کر کے گردن جھکائے بیٹھا رہے ۔شمس الدین عظیمی کے نزدیک ''مراقبہ دراصل تفکر کا دوسرا نام ہے ۔ایسا تفکر جس سے انسان کو اپنی انا ذات شخصیت یا روح کا علم حاصل ہو جائے'' مراقبہ دراصل ایک طرز فکر ہے جس کے ذریعے مراقبہ کرنے والے خود کو ظاہری حواس سے لاتعلق اور آزاد کر کے باطنی حواس میں سفر کرنے لگتا ہے ۔ان ظاہری حواس سے آزادی ہم ارادی وغیر ارادی مدتوں طریقوں سے کر سکتے ہیں ۔مثلاً ہم سوتے ہیں تو ظاہری حواس سے ہمارا ذہن تعلق منقطع کر لیتا ہے خواہ یہ قطعِ تعلق وقتی اور عارضی ہی سہی بہر حال اس کیفیت کو ظاہری حواس سے قطع تعلق کے علاوہ کیا نام دیا جاسکتاہے ۔

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ مراقبہ دراصل نیند کو بیداری میں منتقل کرنے کا ذریعہ بنے ۔

انسانی دماغ میں ہر لمحہ دو کیفیات متحرک رہتی ہیں ۔ایک کیفیت کا نام

بیداری اور دوسری کا نام خواب یا نیند۔ بیداری کی حالت میں وہ زمان و مکان میں مقید ہے لیکن خواب کی حالت میں زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے مراقبہ کے ذریعے خواب کو بیداری میں منتقل کر کے زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزادی کی مشق کرائی جاتی ہے آپ کہیں گے اس کی مثال کیا ہے تو قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ''ہم نے موسی سے تین راتوں کا دعدہ کیا اور چالیس راتوں میں اسے پورا کیا''۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے شمس الدین عظمی فرماتے ہیں کہ حضرت موسی کوہ طور پر صرف 40 راتیں نہیں ہے بلکہ آپ کا قیام 40 دن اور 40 راتیں رہا ایسا بھی نہیں ہوا کہ آپ دن کے وقت کوہ طور سے نیچے آجاتے ہوں۔ مطلب واضح ہے کہ موسیٰ پر 40 دن اور 40 راتیں رات کے حواس غالب رہے۔ وہی رات کے حواس جو زمان و مکان سے کسی انسان کو آزاد کر دیتے ہیں۔

اس کیفیت کی دوسری مثال حضرت علی کا وہ مشہور واقعہ ہے جس کسی جنگ میں دشمن کا ایک تیر ان کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ جب تیر کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو حضرت علی نے تکلیف محسوس کرتے ہو فرمایا کہ میں نماز قائم کرتا ہوں۔ تیر نکال لیا گیا اور حضرت علی کو تکلیف کا احساس تک نہ ہوا۔

اب آجاتے خواب پر

مذاہب اور خاص طور پر اسلام خوابوں کی اہمیت کا نہ صرف قائل ہے بلکہ قرآن پاک میں حضرت یوسف کے نہ صرف اپنے خوابوں کا اندازہ ہے بلکہ ان کے خوابوں کو تعبیر کے علم کو بھی صراحتاً بیان کیا ہے۔

سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا نبوت کی جھلکیوں میں سے صرف مبشرات باقی ہیں۔مبشرات سے مراد سچے خواب ہیں جو کامل متقین کو نصیب ہوتے ہیں۔

قدیم وجدید سائنس خوابوں کی اہمیت کی قائل رہی ہے جدید سائنس کہتی ہے کہ کوئی شخص خواب کی حالت میں اکثر تیز دوڑ رہا ہے تو اس کی حالت بیداری میں بھی اس پر تھکن طاری رہے گی اسی طرح ڈراؤنے خوابوں کے بعد بھی انسان پسینہ سے شرابور پایا جاتا ہے۔

حالت خواب میں ہزاروں میل کے فاصلے پر خود کو دیکھ کر وہاں پر موجود کوئی لذیذ پھل کھانے کے بعد زبان کا ٹیسٹ بڈز کو لذت محسوس ہوتی ہے۔خوابوں کے اثرات بیداری پر مرتب ہونے سے کوئی ذی شعور شخص انکاری نہیں کر سکتا کیونکہ خواب کی حالت میں ایک مخصوص حالت کے طاری ہونے کے بعد ہمیں غسل کی ضرورت ہوتی ہے۔

فرائڈ خوابوں کو نا آسودہ خوہشات کہتا ہے تو ژونگ کہتا ہے ''خواب کو پوری سنجیدگی سے لینا چاہیے گویا وہ ایک واقعہ ہے جو ہمارے ساتھ وقوع پذیر ہوا ہے''

اب آجائیں جسم مثالی پر

کل تک روحانیت جسے جسم مثالی کہتی تھی آج کی جدید سائنس نے اسے Aura کا نام دیا ہے۔یہ ایک اور جسم ہے جو گوشت پوست کے جسم سے تقریباً 9انچ اوپر ہمہ وقت موجود رہتا ہے انسانی گوشت پوست کے جسم کا دارومدار اسی Aura کے اوپر ہے Aura کے اندر صحت مندی موجود ہے تو گوشت پوست کا جسم بھی صحت مند

ہے۔روشنیوں کا بنا ہوا یہ جسم صرف انسان کے لیے مخصوص نہیں زمین کے اوپر جتنی مخلوق موجود ہے۔روشنیوں کے جسم سے Feed ہوتی ہے انسانی گوشت پوست کے اندر جتنے تقاضے پیدا ہوتے ہیں وہ جسم مثالی میں پیدا ہوتے ہیں اور وہاں سے منتقل ہوکر گوشت پوست کے جسم پر ظاہر ہوتے ہیں۔

گوشت اس کے اجزائے ترکیبی میں جہاں مٹی کے ذرات کام کر رہے میں وہاں مٹی کے ذرات کے اوپر روشنی کا ہالہ مستقل اور مسلسل اس کو قائم رکھے ہوئے ہے۔روشنی کا ہالہ (Aura) اگر مٹی کے ذرات سے اپنا رشتہ منقطع کرے تو یہ ذرات فنا ہو جاتے ہیں۔اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی سویا ہوا ہے نیند گہری ہے کراچی میں سویا شخص امریکا کے بازاروں میں گشت کر رہا ہے اس کو سوئی چبھو دی جاتی ہے۔جسم مثالی امریکہ سے چل کر فوراً اپنے لباس کی پاسبانی کے لیے آموجود ہوتا ہے امریکہ سے جسم مثالی کا کراچی آجانا اتنا قلیل وقفہ ہے کہ جس کی پیمائش کس بھی طرح ممکن نہیں اس پیمائش کو آپ لمحے کا کھربواں حصہ کہ سکتے ہیں اور ظاہر ہے لمحے کا کھربواں حصہ پیمائش کے دائرے میں نہیں آتا۔مقصد یہ ہے کہ جسم مثالی کے لیے Time & Space کوئی چیز نہیں علمائے روحانیت تو اعراف جنت، دوزح میزان وغیرہ کو بھی کیفیات کا نام دیتے ہیں۔

اب نتیجہ یہ نکلا کہ ان entities اور وجودوں سے جب آج کی جدید سائنس بھی انکار نہیں کر سکتی تو کیا آج کا تخلیق کار حالت بیداری میں بھی وہ خواب دیکھ سکتا ہے جس کے اندر اسے اپنے خواب پر کنٹرول بھی ہو جس نفسیات کی اصطلاح میں LucidDream کہتے ہیں۔

کیا وہ شعور سے لاشعور میں داخل ہو کر نئے راستے کھوج سکتا ہے کیا ہر زمان ومکان سے خود کو آزاد کر کے بقائے آدم کے لیے نئی منازل تلاش کرتا ہوا دوبارہ اسی خاک پر لینڈ کر سکتا ہے۔

میں مٹی سے رشتہ ختم کرنے کا نہیں کہ رہا۔مٹی ہیں مٹی ہی ہمارا سب کچھ ہے

فریدا خاک نہ نندیو خاک جیڈ نہ کو

جیوندیاں پیریں تلے ہووے مرن اپرن ہو

مگر مٹی ہے تو کشش ثقل ہی لحظ بھر کے لیے ہی سہی کتیھارسس کے لیے اور روشنیوں کے ہالہ کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیں نا کیا مراقباتی یکسوئی Aura اسے مادہ وروح کے مسائل کے حل کے زیادہ بہتر مواقع مہیا نہیں کر سکتی۔کیا آج کا ادیب جنسی کشش کے فتنہ سے جاں خلاصی کے بعد وہ فن وادب میں اونچی اڑانیں نہیں بھر سکتا۔

کیا حالت بیداری میں حالت خواب کو طاری کر کے اور روشنیوں کے ہالہ سے خود کو منسلک کر کے تخلیق کو چار چاند نہ سہی دو چند تو کر ہی سکتا ہے نا! کیا یہ ویسی قسم کی ہی یکسوئی نہیں ہوتی جس کی خواہش چوگا میں قاسمی صاحب کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ

ذرا توڑ کے حشر اونچا کرنا تو سیکھ لیا تم نے

دانہ توڑ کے زندگی برباد کرنا اس بھی فن ہے

کیا تخلیقی اذہان کچھ ایسی تخلیق کر سکیں گے میں شعراء کو سائنس دانوں سے ویسے بھی افضل سمجھتا ہوں کہ شعراء کے ذہن نے اڑنے والے قالین پہلے تخلیق کیے اور سائنس دانوں نے جہاز بعد میں بنائے۔کیا وہ کوئی ایسا عالمگیر بیانیہ تشکیل دے سکیں

گے جو سب کے لیے قابل قبول بھی ہو اور قابل عمل بھی۔ کیا وہ خود کو فتنہ عورت وفتنہ مادہ سے آزاد کر کے روح کی پاکیزگی کی جانب اقوام عالم کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے پائیں گے کہ بالا آخر اقبال کے الفاظ میں قومیں شعراء کے اذھان میں جنم لیتی ہیں کیا وہ کوئی ایسی عالمگیر زبان تشکیل دے پائیں گے جو وطن پرستی علاقہ پرستی نسل پرستی اور متعصب معاشی نظاموں سے آزاد ہو جس میں داس، مورز، آتنگ وادی اور Terrorist جیسے الفاظ نہ ہوں جس کے حروف وحدت کے سمندر سے بخارات بن کر عقیدت کے باران کو جنم دے کر محبت کی سرزمین پر اخلاص کے پودے تخلیق کرتے ہوں۔ کیا تخلیق کار بیداری وخواب۔۔۔۔ جسم اور جسم مثالی ہر دو سے کام لیتے ہوئے خاک وخاک نشینوں اور عرش اور عرش نشینوں سے اپنا رشتہ برابر استوار رکھنے میں کامیاب ہو گا۔۔۔ یقیناً ہو گا۔۔۔ کیوں کہ رب العالمین کا فرمان ہے

انسان میں نے تیرے لیے سب کچھ مسخر کر دیا ہے

ویسے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب جیسا رند کسے زعم میں یہ دعوی کرتا ہے

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

خبر نہیں نے اپنے مضامین کو آخر بیکن نے Dispersed Meditation کن معنوں میں کہا ہے البتہ فیضان نظر میں شورش نے جو اقبال کا فلسفہ شاعری بیان کیا گیا ہے اس سے تھوڑی بہت روحانی گرہیں کھلتی محسوس ہوتی ہیں

ابن عربی نے حالت خواب میں سرکار دوعالم کی طرف سے دے گئے علوم فصوص الحکم کے قالب میں ڈھالا ہے او بطریق رویا و روحانی تصرف سے جو کچھ ملا وہ

لوح وقلم کی شکل میں قلندر بابا اولیا نے ہمیں عطا کیا۔

بابا جی کے کاجل کوٹھے اوران کی دیگر تصنیفات سے ایسا لگتا ہے کہ کم از کم انہوں نے پچھلی تین صدیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوں۔کیسے؟ یہ وہ بہتر جانتے ہیں۔جو شخص اردو صحیح سے پڑھ بھی نہیں سکتا وہ ایسے ایسے شاہکار تخلیق کرے جو کئی علوم کا مجموعہ ہوں اورجن پر یورپ میں ریسرچ ہورہی ہوتقریباً تقریباً ناممکنات میں سے ہے اب یہ بھی نہ سمجھیے گا کہ میں شیکسپئر اور مارلووالا معاملہ بیان کر رہا ہوں۔مسئلہ روحانیت کا ہے۔

اورایسی مثالوں کی تعداد کم نہیں ہے عہد حاضر کے ممتاز شاعر منصور آفاق کی نیندکی نوٹ بک میرا تھیسز مضبوط کررہی ہے۔

(آخر میں جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ یہ جو کشف اور روحانیت کی بات چل رہی ہے اس کا یہ بھی مطلب کہ کوئی کشف کو الہام بنا کر نبوت کا دعوی ہی کر ڈالے خواہ اس کا نام مسیح موعود و مسیح اقدس یا پیغمبر بروزی وظلی ہی کیوں نہ ہو)

فیض اور وطن

Sir Walter Scottنے کہا تھا

"Breathes there the man with
soul so dead,
who never to himself had said,
This is my own, my native land"

نظیر و اقبال کی استثنائی مثال سے قطع نظر فیض سے قبل شائد ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کی شاعری میں وطن کی شاعری کا اتنا گہرا احساس ملتا ہو۔فیض اقبال کیطرح ایک عالمگیر پرامن معاشرہ کے قیام کے داعی تھے۔انہوں نے غزل کے قدیم اور روایتی متن مرکزی کرداروں یعنی عاشق عشق اور معشوق میں چوتھے کردار وطن کا خوشگوار اضافہ کیا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی شاعری میں اس جذبہ کی فراوانی حسن معشوق کو ماند کر دیتی ہے۔نسخہ ہائے وفا کے عمیق تجزیاتی مطالعہ سے وطن اور محبوب کے حوالہ سے اشعار کا تناسب 80:20 سامنے آتا ہے۔اور اگر نقادان کے استعاراتی وتشبیہاتی نظام سے گہری واقفیت رکھتے ہوئے بین السطور مفاہیم کی تہوں کی شناوری کرنے کی استعداد رکھتا ہو تو تناسب 90:10 ہو جاتا ہے اور یوں نسخہ ہائے وفا،نسخہ ہائے محبت وطن بن جاتا ہے۔مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ،سوچ، رقیب سے۔چندروز اور میری جان،ہم لوگ،صبح آزادی،ترانہ،ایرانی طلباء کے نام

وغیرہ جیسی درجنوں نظمیں خالصتاً جذبہ حب وطن کے تحت لکھی گئی ہیں۔ گو فیض سے پہلے انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی تہذیب وتمدن کی شکست وریخت کا عمل شروع ہو چکا تھا اور محبوب یوسف سا نہ رہا، اب کہاں وہ معشوق میر جس سے غبار میر دور جا کے بیٹھے۔ اب مومن کے پردہ نشین کہاں نہ وہ غالب کا زمانہ کہ محبوب مدعی تو کیا خدا کے حوالہ کرنے سے عاشق کترائے یعنی بقول اقبال نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں اور خود عاشق کا وہ رکھ رکھاؤ، وہ بانکپن ونرگسیت وہ رسمی اخلاق سب مٹ گئے۔ بقول پروفیسر عبدالجبار شاکر اب مشین کا اتنا شور ہے کہ بلبل کی صدا کون سنے اور سڑکوں پر اتنی بھیڑ ہے کہ سوئے گلشن جانے کی فرصت کس کو ہے۔ حسرت و فراق نے محبوب کی ارضی سطح دریافت کی تو اب کاروباری سطح بھی دریافت ہو چکی۔ محبوب کی شکلیں بدلنے لگیں تو فیض نے دھرتی ماتا کو اپنا محبوب بنالیا اور کیا خوبصورت انتخاب تھا اور یہ محض حسن انتخاب ہی نہیں بلکہ اسکی ٹائمنگ شاید خود انتخاب سے کم اہم نہیں تھی۔ جنگ عظیم دوم ہجرت کا سانحہ اور معاشی وسیاسی مسائل سے آپ لوگ بخوبی آگاہ ہوں گے۔

فیض کی محبت خالی خولی اور نعرہ مستانہ تک محدود نہیں تھی۔ فیض نے نہ صرف وطن سے محبت کی بلکہ اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کی۔ فیض کو اپنی وطن پرستی اور انسان دوستی کو ثابت کرنے کے لیے ہزاروں آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پابند سلاسل ہو کر بھی وفا شعاری سے منحرف نہ ہوئے جاں گسل اذیتیں بھی ان کی راہ صدق مودت میں سد راہ نہ بن سکیں۔ اگر وطن کی حرمت آزادی نے ان سے جس جس قربانی کا تقاضہ کیا انہوں نے لیلائے وطن کے قدموں میں نچھاور کر دی۔ اس راہر وعشق کے

قدموں میں نہ لغزش آئی اور نہ اس شاہسوار نے گردن جھکائی۔انہوں نے محبین وطن پر واضح کر دیا کہ رسم وراہ شہر نگاراں کیا ہے اور قیمت گلگشت بہاراں کیا ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں

مرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

وہ جہاں بھی جاتے ہیں ارض وطن کی یادوں کی کسک، نارنج شگوفوں کی مہک ان کے ہمراہ ہوتی ہے۔ پردیس میں جب یادوں کی چتائیں ستاتی ہیں تو اپنے درد کا بکٹ پہن کر وہ بے دردوں کے سامنے جا کر اپنے وطن کے ترانے پڑھنے لگتے ہیں۔ فلسطین کے کسی بچے کو دیکھیں یا ان کا گزر رلینن گرڈ کے گورستان سے ہو، ڈھاکہ سے ان کی واپسی ہو یا لبنان میں ان کی آمد درامید کا یہ دیوانہ گر دستِ طلب پھیلا کر ارض وطن کے لیے محو دعا ہو جاتا ہے پھر بات دعاؤں تک ہی محدود نہیں یہ دردمند عشق کوچہ بازار عشق سے ریزہ ریزہ خواب چننے لگتا ہے۔

ہم نہ اس صف میں تھے نہ اس صف میں تھے

رستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے
لوٹ کر آ کے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے

شوپین، یا سر عرفات، قاسن قلی، ناظم حکمت، عمر علی سلیمان کو موضوع سخن بنانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ یہ انقلابی شخصیات ان کے خوابوں کی تکمیل نظر آتے ہیں۔ وہ تو سوئے جنت بھی راہ وطن سے جانے کے خواہاں ہیں۔

رحمت حق سے جو اس سمت کبھی راہ ملے
سوئے جنت بھی براہ راہ جاناں چلے
نذر مانگے جو گلستاں سے خداوند جہاں
ساغر مئے سے خونِ بہاراں چلے

فیض کے ہاں جو انقلابی و مصلحانہ رنگ ملتا ہے وہ دھرتی سے محبت کا نتیجہ ہے اور یہ بذات خود اردو شاعری میں ایک منفرد تجربہ تھا۔ دھرتی سے محبت کا یہی فیض ہے کہ فیض کا محبوب ستم گر نہیں رہا وہ گلاب ہے سراپا خوشبو ہے وہ وجہ کاروبار گلشن ہے۔ اس کے دست عنایت سے کنج زنداں میں عجب دل نوازیوں کا سامان میسر ہے۔

ے مہک رہی ہے فضا یار کی صورت
ہوا ہے گرمئی خوشبو سے اس طرح مست

ابھی ابھی گزرا ہے کوئی گلبدن گویا
کہیں قریب سے گیسو بدوش، غنچہ بدست

ے کھلے جو دریچہ میں آج حسن کے پھول
جو صبح جھوم کے گلزار ہوگئی یکسر

ے جہاں کہیں بھی گرا نورنگاہوں سے
ہر ایک چیز طرح دار ہوگئی یکسر

محبوب کے بدلنے سے بہت سی علامتوں کے مفاہیم بھی بدل گئے۔ محبوب کے اردگرد پھیلے ہوئے کئی تلازمات شاعر کا موضوع بنے مثلاً دھرتی کے ننگ دھڑنگ بھوکے بچے اور افلاس زدہ مزدور، دھرتی میں محبت اور حسن کو عام کرنے والے قلم کار ادیب، مصور و شاعر فلسفی، دھرتی کو پھولوں سے بھرنے والے کسان، شاعر کے جذبہ محبت کے ساتھی بن گئے۔

غم جہاں ہو رخ یار ہو کہ دست عدد
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

انتساب

آج کے نام

اور آج کے غم کے نام

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام----

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

دھرتی جب محبوب بنی تو رقیب بھی رقیب نہ رہا۔فیض سے قبل واحد مثال غالب کی ہے جس نے رقیب کو گوشت پوست کا ایک انسان سمجھا اسے احساس ہوا کہ رقیب کے سینہ میں بھی دل دھڑکتا ہے بلکہ وہ تو قابل صدرشک ہے کہ محبوب کی عقیدتو ں اور محبتوں کا محور ہے۔

ے ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے نو بہار
میرا رقیب ہے نفس عطر سائے گل

ے یہ رشک ہوتا ہے ہم سخن تم سے
ورنہ خوف بدآموزی عدو کیا ہے

ے نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

لیکن فیض کے معاملہ میں بات یہیں تک محدود نہیں جب انداز نظر بدلتا ہے تو منظر بدل جاتا ہے۔

ے جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
منظر تو انسان کے اندر ہوتا ہے

کے مصداق جذبہ حب الوطنی نے موڈ ہی بدل ڈالا۔آنکھوں پر پڑی غربت کی پٹی ہٹ گئی۔ریٹینا کے منظر صاف دکھانے شروع کر دیئے آنکھیں کشا ہوئیں دل کشا ہوا اور کلائیڈ سکوپ میں منظر نامہ دلکش بنا گیا۔کوچہ لیلیٰ کا سگ، قطمیر کہف بن گیا۔بات یہاں ختم نہیں ہوتی فیض تو رقیب کو راہ الفت کے پیچ وخم سے آگاہی کو مصرف صیحہ میں خرچ کرنے کے لیے دعوت دیتے ہوئے یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ اس عشق مجازی سے یہ سب میں نے سیکھا ہے تمہیں بھی یہ سبق کشید کرنا چاہیے اور وہ سبق یہ ہے ''رقیب سے''،نظم میں وہ کہتے ہیں۔

ے عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

اقبال نے کہا تھا کہ خدا+اشتراکیت=اسلام

فیض نے اشتراکی نظریہ اس لیے اپنایا کہ غریبوں مزدوروں کے خون پسینہ

پر عیاشی کرنے وال سرمایہ دار طبقہ کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لیے اور کوئی قابل عمل متبادل راستہ میسر ہی نہیں تھا۔ وہ غریب جس کے لیے Abbery نے کہا تھا۔

He slept beneath the moon, He basked beneath the sun,He lives life of going to and died with nothing done.

تو فیض بھی اس کے ہم آواز ہوئے۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیئے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجیئے

غریبوں، مزدوروں بے کسوں کی نوا بننے والے فیض کو تبھی اشفاق احمد جیسے صوفی نے کہا تھا کہ فیض ایک ملامتی صوفی ہے۔ فیض حریت آدم کی راہ سخت کا وہ راہگیر ہے جو خیال دم تعزیر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ وہ مرد صفا کیش ہے جس کا رنج اسیری سے رشتہ زنجیر بہت پرانا ہے۔ جس نے مایوس و نا امید ہونا نہیں سیکھا۔ "ولکم فی القصاص حیوۃ" کو نصب العین سمجھنے والا اہل وطن کو یہ مژدہ جان فزا بھی سناتا ہے۔

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھڑ دھڑ دھڑ کے گی

اور اہل حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی

افسوس قندِ دہن سے لطفِ سخن کو بڑھانے والا، ہر قدم عاشقی کر کے زندگی کو سہل کرنے والا، ان داتاؤں و کج کلاؤں بے زاروں کی دلداری کرنے والا، بحر خون میں شناوری کرنے والا فیض ساری عمر اپنے خوابوں کی تکمیل نہ دیکھ سکا۔ آج بھی منوں مٹی تلے اس کی روح مرگ انبوہ کا تہوار منا کر اس خاک وطن سے سوال کرتی ہے کہ میں نے تو کہا تھا

؎ کہ جس کی خاک میں قدرت ہے کیمیائی کی
یہ نائبانِ خداوندِ ارض وطن کا مسکن

اے خاک! صدی گزر گئی پھر کوئی قائد و اقبال کیوں نہ اٹھا کیا قدرت نے قائد و اقبال پیدا کرنا بند کر دیئے ہیں؟

کرچی کرچی۔۔۔۔ایک مطالعہ

تیرے اشعار میں اکثر بخاری

یہ کالا باغ والا پل ملا ہے

اب کون اس کی معنویت پس منظریت سے آگاہ ہوگا۔۔۔۔۔جس سے مجھے آگاہی اور آگہی عاصم کی دیرینہ معیت کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ یہ پل عاصم کی منزل سے بس ذرا پہلے اور آخری رکاوٹ تھی، کسے خبر کہ اسے پہلی بار عبور کرنا اس کے لئے پل صراط سے کسی صورت کم نہ تھا اور اب تقدیر اسے ہر روز جی ہاں ۔۔۔۔ہر روز اسی کارن ہی آر پار کراتی پھرتی ہے کہ روز یہ پل اس (اللہ) کی عنایات یاد دلانے کے علاوہ یہ بھی باور کراتا رہے جو (دن) غافل سو (دن) کافر۔ کسے خبر کہ یہ اس کی شاعری کی مقامیت سے زیادہ اس کے مقام کی بھی علامت ہے کسے خبر کہ یہ پل اب (لیک پوائنٹس) بن گیا ہے جہاں عاصم بخاری کے ہم نواؤں کا پورا ایک گروہ تشکیل پا چکا جو نیچر کو تو نر چر کر ہی رہا ساتھ انسانی قدروں کی احیا کا فریضہ بھی سرانجام دینے لگا ہے کسے خبر کہ اس پل سے گزر کر وہ دو تہذیبوں کے امتزاج کی سعی کرتا رہتا ہے کسے خبر کہ اس پل کی مانند وہ روز کتنے ہی بکھرے بچھڑے دلوں کو ملانے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ کسے خبر کہ اس کی اس پل سے گزران ٹھنڈے میٹھے پانیوں سے مس ہو کر آتی ہوا کو مشام جاں بنا کر کتنے ہی کالے باغوں کو ہرا کرنے کے جتن کرتی رہتی ہے کسے خبر کہ اس پل سے وابستہ نو آبادیاتی نظام کی کڑوی یادیں بھی اس ستاتی ہیں۔۔۔کس خبر۔۔۔۔متن کو سب کچھ سمجھنے والو۔۔۔۔متن والا بھی کچھ

ہوتا ہے اور متن والے سے آگاہ ہونے والا بھی۔۔۔

عاصم کا ذہن سماج میں پھیلی برائیوں محرومیوں نامرادیوں سے ہمیشہ کرچی کرچی ہوتا رہا۔سارے زمانے کا غم اس کے جگر میں ازل سے موجود رہا۔اس کی متدین ذات ہر زخم ہر محرومی کو حرز جاں سمجھ کر سنبھالے رکھنے پر آمادہ رہی مگر وہ سینے میں حساس دل اور لاتقنطوا کے فرمان پر تیقن کے بھروسے یوٹوپیا کی جگہ ایک پر امن سوسائٹی کا امیدوار رہا۔

میں جب عاصم کا نفسیاتی مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے عاصم کا سیال ذہن ساگر ماضی کی طرف بہتا نظر آتا ہے ان کی فوٹوگرافک میموری فلیش بیک کی سیڑھی اترتی گمشدہ دریچے وا کرتی ہے تو وہ شعوری آنکھ کے نردبان کے سہارے جس فاصلے کو طے کرتا ہوا لاشعور سے شعور کی طرف مراجعت کرتا اس فاصلے کو ''برزخ لایبغیٰن'' ہی کہہ جا سکتا ہے بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، وہ ان دونوں سے متصل استقبال کی ہلکی سی جھلک دکھا کر اپنے معجزۂ فن سے قاری کو چونکا دیتا ہے۔اس طرح کی فن کاری کے پیچھے برسوں کا علم تجربہ ہوش مندی تپسیا کی کارفرمائی ہوتی ہے اور خیر سے عاصم صاحب عمر کے اس حصے میں ڈیڑھ عشرے سے قدم افروز ہو چکے ہیں جسے پیغمبری عمر کہا جاتا ہے۔ویسے آگ لینے کے واقعے سے پہلے میں عاصم صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں جب آتش جوان تھا۔پھر یہ دعویٰ انہی کو سزاوار ہے۔

اس نے ایک پہاڑ کھودا تھا
میں نے کتنوں کو کھود ڈالا ہے

میر، میراجی، مجید، منٹو سے اس کی شعری اقلیم کی ابتدا ہوتی ہے اللہ جانے میم

میں کیا راز ہے کہ اس کا محبوب احمد بلا میم بھی تو محمد ہے ویسے عاصم کے اسم کی انتہا بھی تو میم پر ہوتی ہے اس کی شاعری میں منٹوی طنز ملاحظہ ہو۔

؎ روزہ میں رکھ رہا ہوں سبھی کو خبر یہ ہو
سحر کے وقت کرتا ہے میسیج وہ اس لئے

؎ حیرت کی بات ہے کوئی خوف خدا نہیں
ڈرتے ہیں لوگ کیمرے کی آنکھ سے فقط

بعض فردیات میں بے ساختہ پن کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے

تیری عبادتوں کا زمانہ ہے معترف
قبلہ معاملات کا بھی کچھ درست کر

آپ کرتے ہیں صرف باتیں اور
صرف باتوں سے کچھ نہیں ہوتا

صالح نبی کی قوم پہ آیا عذاب کیوں
قاتل تو اونٹنی کے فقط چار لوگ تھے

پیڑ ایسا کوئی لگا جائیں
جس کے سائے میں لوگ ستائیں

بعض مقامات پر ہلکا ہلکا انور مسعودی رنگ بھی نظر آتا ہے

؎ روزہ رب کے لئے رکھا لیکن
فیس بک پر بتایا دنیا کو

؎ داد کیوں شعر کی اسے دوں میں
حوصلہ اس کا بڑھ گیا تو پھر

کوشش کے باوجود بھی عورت کے جسم پر
لباس کو ملبوس کے معنی نہ مل سکے

ان کے اس شعر

ہے یہی راز اس کی صحت کا
نت نئے چہرے دیکھتا ہے وہ

کو پڑھ کر میرا ذہن کے ایل گابا کی کتاب His Highness کے نواب کی طرف جا پہنچا جس کے بارے میں مختیار مسعود نے لکھا تھا۔

''انگریز کا ناشتہ انڈے اور چائے، امریکی کا ناشتہ دلیہ اور کافی، فرانسیسی کا ناشتہ پیسٹری اور قہوہ اور ہز ہائی نس صبح کے ناشتے میں دوشیزہ پسند کرتے ہیں۔

عاصم بخاری کی فردیات صرف ایک فرد کی آپ بیتی نہیں بلکہ یہ ہمارے معاشرے کے باشعور اور حساس طبقے کا احتجاج ہے اس جبر جہالت، ذاتی خواہش، تعصب اور خودغرضی کے خلاف۔

اس نے ذاتی محبت، ذاتی خواہش والا غم تو اکا دکا فردیات میں بیان کیا ہے اس کا دکھ اس کا روگ ٹوٹتی ہوئی انسانی قدریں ہیں۔ اس کا غم سسکتی ہوئی انسانیت ہے، اس کا حزن بکھرتی ہوئی معصوم آرزوئیں ہیں اسے شکوہ غریبوں کی غربت سے زیادہ ان کے بھول پن سے ہے اسے افسوس امیروں کی بے پناہ دولت کے ارتکاز پر نہیں اسے شکایت ان کے منکرانہ رویوں سے ہے اسے اولڈ ہاؤسز کا ماتم نہیں کرنا اسے بیٹوں سے یہ گلہ ہے کہ وہ باپوں کا گلا نہ گھونٹیں اس نے ریاست سے شاید کبھی کوئی شکایت کی وہ صرف شکوہ کناں سماج کے رکھوالوں سے ہے کہ انہیں فرد کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔

عاصم بخاری ماہر تعلیم ہیں مگران کے اشعار میں کبھی آج کے نام نہاد تعلیم کے بھاشن نہیں ملتے وہ تربیت اور کردار کے تمنائی ہیں انہیں زبان و بیان سے شغف ہے نہ صنائع بدائع کی فکر انہیں فلسفیانہ موشگافیوں سے کچھ عرض ہے نہ عالمانہ اسلوب نگارش سے کچھ لینا دینا۔اسے سہل انداز میں سادہ معصوم سے دل کی ننھی ننھی چھوٹی چھوٹی سی خواہشوں کے باطن کو سرِعام رکھ کر دینا ہے۔غالب وذوق کے دیوانو! یہ تمہاری دکان نہیں کون ہے اس جنس ارزاں کا خریدار۔۔۔جنس گراں کے خریداروں کو یقیناً مایوسی ہوگی۔

اردو ادب کے فروغ میں صوفیائے کرام کا کردار

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں جہاں علماء وصوفیاء کی خدمات زریں حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں وہاں اردو زبان وادب کی ابتدائی تاریخ سے یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ زبانِ اردو کی ترقی وترویج میں ان ہستیوں نے مقدور بھر حصہ ڈالا۔ یہ علماء وصوفیا نہ صرف علوم اسلامیہ پر کامل دسترس رکھتے تھے بلکہ ان کی کثیر تعداد شعر وشاعری سے بھی شغف رکھتی تھی۔شاید اس کی وجہ شاعری کی اثر آفرینی ہو بہرحال ان کی شاعری کے نمونے پند ونصائح کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کے اشارے بھی دیتے ہیں۔

ان صوفیاء کی منفرد خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے سماجیات واقتصادیات اور لوگوں کی نفسیات کے مطابق اپنے پیغام کو پیش کیا اسی وجہ سے سلاسل چشتیہ ہوں قادریہ،سہروردیہ یا نقشبندیہ سب ہی کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

ان صوفیاء کے اقوال و ملفوظات اور رسائل وتذکار نہ صرف مریدین و عقیدت مندوں کے قلوب واذہان کو منور کرتے رہے بلکہ ایک ایسی بولی کے فروغ کا سبب بھی بنتے رہے جو آگے چل کر دنیا کی سب سے بڑی زبانوں میں شمار ہوئی۔

اگرچہ صوفیاء کا حقیقی مقصد تبلیغ واشاعتِ دین ہی تھا تاہم وسیلہ زبان سے ترسیل وابلاغ کے یہ سلسلے ان کے باطنی صدق وخلوص سے عوامی مقبولیت حاصل کر کے دین وملت کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت اور زبان وادب کی نشوونما کی وجہ ٹھہرے۔

ایثار وخلوص وعقیدت کے سائباں تلے شجر اردو بالیدگی ونمو پاتا رہا۔اور آج یہ تن آور درخت کا روپ اختیار کر چکا ہے۔

صوفیاء کرام کے اس پہلو کی طرف مولوی عبدالحق اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بلا امتیاز ہر قوم وملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور صحبت کو موجب برکت سمجھتے۔ عام خاص کی کوئی تخصیص نہ تھی۔خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔اس لئے تلقین کے لئے انہوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تا کہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔''(۹)

اردو زبان کے ارتقائی سفر میں جن صوفیاء نے اپنی شاندار خدمات پیش کیں ان میں سے چند ایک کا ذکر یہاں اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی:

ہندالولی اور غریب نواز سے ملقب خواجہ معین الدین چشتی کا کوئی معتبر قول تو ہندی (اردو) زبان میں نہیں ملتا تاہم ان کی عالمگیر شہرت کو دیکھتے ہوئے یہ قرین قیاس ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے کہ ہندو بھی ان کے مسلمانوں سے کم معتقد نہیں تھے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر:

بابا فریدالدین گنج شکر ان درویشوں میں سے ایک ہیں جنہیں آٹھ صدیاں گزرنے کے بعد بھی دلوں سے نہیں بھلایا جا سکا۔جنہوں نے ہزاروں آرزومندوں کو منزل مقصود پر پہنچایا۔ والد نے مسعود نام رکھا مگر اپنے مرشد فریدالدین عطار نے نہ

صرف اپنا نام عطا کیا بلکہ اپنے قلبی و باطنی فیوضات سے ایسے نوازا کہ فرید کے رنگ میں رنگ گئے۔ مقبولیت وقبولیت عام کی اس سے بڑی سند کیا ہوگی کہ گرو گرنتھ میں ان کا کلام شمولیت پا کر الہامی کلام کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔

بابا فرید کی شاعری کے بارے میں گریجن سنگھ طالب رقمطراز ہیں:

''فرید کی شاعری میں انسانی دکھ درد کی جو عکاسی ملتی ہے عظیم شاعری کے

علاوہ شاید ہی اور کہیں اس کی دوسری مثال مل سکے۔'' (2)

بابا فرید کی غزل کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں۔

وقت سحر وقت مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	نسب چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با تن تنہا چہ روی زیر زمین	نیک عمل تن کہ رہی سات ہے

شیخ شرف الدین بو علی قلندر:

مجازیب پاک و ہند کے امام اور اسرار مشائخ چشت کے راہنما بو علی قلندر کا سلسلہ نسب امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ملتا ہے۔ آپ برصغیر پاک و ہند کے کبار اولیائے کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ 724ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے کلام کو سن کر میر خسرو آبدیدہ ہوئے تو آپ نے فرمایا ''ترُکا کچھ سمجھدا ہے''۔ خسرو نے جواب دیا اسی لیے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھتا۔

نمونہ کلام

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

امیر خسرو:

ننانوے تصانیف کے مصنف اور گیارہ بادشاہوں کے ادوار کے شاہد ابوالحسن یمین الدین المعروف امیر خسرو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور عالم تھے۔ان کے دستیاب شعری ونثری سرمایہ میں امتدادِ زمانہ سے اتنی تبدیلیاں آچکی ہیں کہ اب اسے مستند نہیں مانا جاسکتا۔لیکن یہ بات مسلم ہے کہ خسرو نے اردو زبان میں شاعری کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں خسرو نے ایک طریہ تو یہ اختیار کیا کہ ایک مصرع فارسی لکھا اور ایک مصرع اردو اور دوسرا طریقہ یہ کہ آدھا مصرع فارسی اور آدھا مصرع اردو کا رکھا۔تیسرا طریقہ یہ کہ دونوں مصرعے اردو کے لائے۔''(3)

میر تقی میر نے ''نکات الشعراء'' میں خسرو کا قطعہ تبرکاً لکھا ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑ پے سنوار ہے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا''(4)

شیخ لطیف الدین دریا نوش:

'خزانہء رحمت' کے مصنف نے آپ کو شیخ نظام الدین اولیاء کا خلیفہ بتایا ہے۔فقر و غنا کی نعمت کبریٰ سے سرفراز شیخ دریا نوش نے ساری عمر اپنا گھر نہیں بنایا۔ پوچھنے پر فرمایا:

آرے آرے بابا ہم بنجارے
کیا گھر کرتے ہیں بنجارے

یہ شعری جواب اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ زبان جسے ہندی کہتے تھے اور جو باوجود تغیر و تبدل کے کچھ مدت قبل تک ہندی کہلاتی رہی اور اب اردو کے نام سے موسوم ہے کس طرح ہمارے ملک میں اندر باہر چھائی ہوئی تھی۔

شاہ برہان الدین غریب:

شاہ صاحب بھی نظام الدین اولیاء کے فیض یافتہ تھے۔ معارج الولایت کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپ کی کرامات کی شہرت اتنی تھی کہ شیخ زین الدین داؤد شیرازی جیسی ہستی نے بھی آپ کی بارگاہ میں حاضری دی۔ آپ کے ملفوظات ''ہدایت القلوب'' کے نام سے مرتب ہو چکے ہیں۔

آپ کے احوال میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی تو بابا فرید گنج شکر کی صاحبزادی ''بیوی عائشہ'' نے بہ زبان ملتانی فرمایا۔

''اے برہان ساڈی دھیہ کہ کیا ہنسدا اہے''

یعنی تو ہماری لڑکی کو دیکھ کر کیوں ہنستا ہے۔

اس سے مولوی عبدالحق نے یہ استدلال کیا ہے کہ

''یہ بزرگ مقامی اور وطنی بولیوں کو بلا تکلف بولتے تھے اور اس کے استعمال سے کبھی عار نہ کرتے تھے بل کہ ان کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے تھے''(5)

حضرت گیسو دراز بندہ نواز:

سید محمد حسین المعروف گیسو دراز 1321ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ امام زین العابدین کی اولاد امجاد سے ہیں۔ سلسلہ نسب 22 واسطوں سے رسالت مآب ﷺ تک پہنچتا ہے۔

شبیر حسن چشتی نظامی کے مطابق گیسودراز محبوب الٰہی سے بیعت تھےؒ (6)

شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ آپ کے گیسوئے مبارک زانو تک دراز تھے۔ ایک روز آپ اپنے شیخ کی پالکی کندھے پر لیے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے آپ کے گیسوئے مبارک پالکی کے پایہ میں پھنس گئے۔ فرط ادب سے شیخ کی سواری کو روکنا گوارا نہ کیا۔ اس واقعہ کی اطلاع حضرت شیخ کو ہوئی تو از راہ شفقت فرمایا:

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد

واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

یعنی جو کہ سید گیسودارز کا مرید ہوا بخدا یقیناً وہ عشق باز ہوا۔

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ آپ نماز ظہر کے بعد ان طلباء کو جو فارسی سے ناواقف تھے کو حدیث وتصوف وسلوک کا درس ہندی زبان میں دیتے تھے۔ ان کے رسالہ معراج العاشقین میں سے نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''اے عزیز! واصلاں خدا سوں ملنا جدا ہونا یو دونوں بھی نیں یو بات پیر سوں معلوم ہوئیگی یو پیغمبر کو اس ترتیب سو معراج کی خبر دیکھ بندے کوں سرفراز کر کو پہنچایوں حضرت وصل کا خوش حالی کا دو رکعت نماز ایک رکعت جبریل کیطرف سوں ایک اپنے طرف سوں نیت بند کر نماز پرہے کیے۔'' (7)

شیخ بہاء الدین باجن:

آپ گوجری ادب کے چار اہم ستونوں میں سے ایک ہیں۔ آپ 1388ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تصنیف خزائن رحمۃ اللہ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی زبان پر برج اور ہندی روایت کا گہرا اثر تھا۔

شیخ کے کلام میں نظمیں، گیت، دوہڑے، قطعے اور جکریاں ملتی ہیں۔ جکری ذکری کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور اس کا ماخذ ذکر ہے۔ اس کا اطلاق ایسی نظموں پر ہوتا ہے جس میں اور مضامین کے علاوہ سلسلے کا شجرہ اور مشائخ کی مدح بھی ہوئی ہے۔

بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری

''لسانی اعتبار سے باج کی تصنیف خزائن رحمۃ للہ بہت قدر و قیمت کی حامل ہے۔
اس کی اہم ترین قدر یہ ہے کہ یہ اردو کے قدیم ترین روپ کا مستند نمونہ ہے۔'' (8)

نمونہ کلام

با جن جس وہ کرے کرم
پاپ بھی ہووے ہووے دھرم
منزل منزل جہاں اتروں تھاتھوں رکھ والا
پریم مرا جی بھر کر دینے تیرت ہات پیالہ

شیخ رزق اللہ:

آپ خاتم المحدثین شیخ محقق عبدالحق کے عم بزرگوار تھے آپ فارسی میں مشتاق تخلص کرتے تھے جب کہ ہندوی میں ان کا تخلص راجن تھا۔ ہندی کلام کے دو مجموعے بنام پیمان اور جوت نرنجن ہیں۔

مصنف اخبارالاخیار نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے:

''مخدومی عارف زماں مشتاقے
دے گفت بوقت نقل مشتاق حتم
حشے جو بتاریخ وفاتش نگریست
نوک قلمش ہماں سخن کر رقم'' (9)

اس قطعہ سے ''رحمۃ اللہ و علی جمیع اسلافنا'' برآمد ہوتا ہے۔

شمس العشاق شاہ میراں جی:

بعض تذکروں میں ان کا نام میراں جی ہے جب کہ مجمع الانساب میں ان کا نام میراں خاں عرف میراں جی لکھا ہے۔ڈاکٹر حسینی شاہد کی تحقیق کے مطابق ان کا نام شمس الدین ہے شمس العشاق کے اپنے منظوم شجرہ سے البتہ ان کے نام امیرالدین کی توثیق ہوتی ہے۔

ان کی جائے ولادت کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی آراءایک دوسرے سے متضاد ہیں۔''قدیم اردو''میں انہوں نے جائے پیدائش بیجاپور تو اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاء کرام کا کام''میں جائے ولادت مکہ قرار دی ہے جب کہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے ان کی جنم بھومی گجرات بتائی ہے۔

میراں جی کی زبان کے بارے میں محمد ہاشم علی یوں رقمطراز ہیں:

''میراں جی کے سامنے یہ مسئلہ رہا کے زبان کونسی استعمال کی جائے چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ عربی اور فارسی میں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔لیکن عوام سمجھ نہیں سکتے اس لیے ہندی مں لکھنا چاہیے۔(۱۰)

نمونہ کلام

یہ ہندی بولوں سب اس ارتوں کے سبب
یہ بھاکا بھلسو بولی پن اس کا بھاوت کھولی
یوں گرمکہ پند پایا تو ایسے بول چلایا
وے عربی بول نے جانے نا فارسی پچھانے

(شہادت الحقیقت)

شاہ برہان الدین جانم:

شاہ برہان الدین جانم شمس العشاق میراں جی کے فرزند و خلیفہ تھے۔ تصوف وسلوک پر ان کے منظوم رسائل ملتے ہیں۔ ان کا کلام میراں جی سے زیادہ صاف ہے مشکل موضوعات پر بھی ان رواں اسلوب ہے۔ دوہا اور مثنوی ان کی پسندیدہ اصناف تھیں۔

ڈاکٹر اور سدید نے ان کے بارے لکھا ہے:

''جانم شیریں اور لطیف زبان میں شعر کہنے والے تھے ان کا کلام سادہ ہے
مگر شاعرانہ لطافت سے خالی نہیں۔''(۱۱)

ان کا نثر کا رسالہ ''کلمۃ الحقائق'' مکالمے کی صورت میں تصوف کے مسائل کا بیان ہے۔

نمونہ کالم

بن عشق بدھ کو سوج نہیں
اور بن بدھ عشق کی گوج نہیں
جسے آپ کو کھوجیں پیو کو پایں
پیو کو کھوجیں آپ گنوائیں

شاہ امین الدین اعلیٰ:

محبّ نامہ کے مصنف امین الدین اعلی شاہ برہان کے فرزند ار جمند و جانشین تھے۔ جنوبی ہند میں گیسو دراز کے صوفیائے چشت کا بازار انہیں کے دم سے گرم رہا۔
ڈاکٹر حسینی شاہد نے لکھا ہے:

''یہ انہی کی بے پناہ شخصیت کا کرشمہ تھا کہ زنار میں تسبیح کے دانے جگمگانے لگے
اور خانقاہوں میں پانچ عناصر پچیس گن کا طوطی بولنے لگا۔''(12)

دوہے مثنوی کے علاوہ ایک غزل قدیم طرز ریختہ میں اور باقی دکنی اردو زبان میں ہیں۔

نمونہ کلام

نبی پرگٹ ذات ظہور ہے
معشوق حق اللہ نور علی نور ہے
حقیقت حقائق ذات کمال ہے
صورت معنی دوالجلال ہے

سید میراں حسین شاہ:

آپ حیدر آباد دکن کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ شاہ امین الدین اعلی سے بیعت ہیں۔ کئی رسائل کے مصنف ہیں۔ لیکن ان کی ضخیم کتاب شرح تمہید ہمدانی بقول مولوی عبدالحق قدیم نثر کی کتابوں میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس سے قبل صرف نثر میں وجہی کی نثر کا نمونہ تھا۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی:

گوجری رویات کا امین یہ نامور بزرگ گوجری ادب کا نقطۂ عروج ہے۔ شاہ علی شاہ ابراہیم کے پسر تھے۔ احمد آباد میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے ان کے کلام کو ان کے ایک مرید ابوالحسن ابن عبدالرحمن قریشی الاحمدی نے ''جواہر اسرار اللہ'' کے نام سے مرتب کیا۔ ان کا کلام فلسفہ ھمہ اوست کا ترجمان ہے۔ گام دھنی مشکل

پسند شاعر تھے ہر بات کو اشاروں میں بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ابہام نمایاں ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

''ان کی شاعری کا مجموعی مزاج ہندوی ہے جس پر ہندوی اسطور رویات صنمیات ورمزیات کا گہرا رنگ چڑھا ہے۔''(13)

نمونہ کلام

کہیں سو مجنوں ہو بر لاوے
کہیں سو لیلیٰ ہوے دکھاوے
کہیں سو خسرو شاہ کہارے
کہیں سو شیریں ہو کر آوے

میاں خوب محمد چشتی:

آپ احمد آباد گجرات کے باسی تھے۔ آپ نے اپنے مرشد شیخ کمال محمد سستیانی کے ملفوظات ''مثنوی خوب ترنگ'' میں نظم کیے۔ پھر اس کی شرح فارسی نثر میں لکھی اور اس کو ''امواج خوبی'' کا نام دیا۔ خوب ترنگ کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ دیگر تصنیفات میں بھاؤ بھید شراب جام نمایاں ہیں۔

مظہر جان جاناں:

شمس الدین نام، جان جاناں عرف اور مظہر تخلص تھا۔ صوفی باصفا اور شاعر یکتا تھے ان کے کلام میں متانت اور تاثیر ہے آپ کے کلام کی زبان اردو کے ارتقائی سفر میں خصوصی اہمیت اس لیے ہے کہ آپ نے قدیم طرز ابہام گوئی کو ترک کر کے

زبان کو صاف کیا اس میں فارسی کی نئی نئی تراکیب اور خیالات پیدا کیے۔ مصحفی اور شوق نے اپنے تذکروں میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

آپ کا باقاعدہ اردو دیوان تو نہیں ملتا البتہ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ 'گاہ گاہی' اردو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ صرف چند اشعار ریختہ ان کی یادگار ہیں۔

نمونہ کلام

اب کوئی ساعت میں آ صیاد کرتا ہے ملول
ایک دم کوں بلبو کیوں بیٹھتی ہو پھول پھول
پھولے ہیں گل چمن میں صنم کا جمال دیکھ
لالہ بدل ہے داغ ترے مکھ کا حال دیکھ
میں دیکھا رات اس کی زلف کے بندوں کو
سحر زنجیر دیکھا دام دیکھا اژدہا دیکھا

میں نے یہاں اجمالاً چند صوفیائے کرام کا ذکر کیا جنہیں نے گو اپنے بنیادی مقصد تبلیغ اسلام کے تحت ہی سہی اردو کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ تاہم ان کے اشعار جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا ان کے مریدین کی نقل و حرکت سے پورے ہندوستان میں پھیلتے رہے۔ اگر چہ اس زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ تھی تاہم یہ صوفیاء و مشائخ کا روحانی فیضان ہی تھا کہ جہاں ان کے اشعار و ملفوظات عقیدت مندوں کے قلوب کو منور کرتے رہے وہیں ایک نئی زبان کی تشکیل میں بھی ممد و معاون رہے۔

بھلے یہ بزرگ بڑے ادباء و شعراء نہ سہی اور نہ ان کا مقصد زبان کی ترقی و اشاعت رہ ہو اور بعض اوقات عروض و قوافی اور اصول و ضوابط کی پیروی نہ کی گئی ہو اور

ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن باندھا جاتا رہا ہو مگر بقول انور سدید:

''تخلیقی روانی اور ادبی رعنائی کی کمی کو خلوص کی فراوانی پورا کرتی رہی''۔(14)

دوسرا ان بزرگوں نے اس نومولود زبان میں لکھنے کو عار نہیں سمجھا اور پھر ان کی دیکھا دیکھی عوام و خواص میں یہ زبان مقبول ہوتی گئی اور عہد بہ عہد اضافات و اصلاحات ہوتی گئیں اور آج اس زبان کی دلکشی وسعت اور شیرینی میں یقیناً ان بزرگوں کی محنت کا ثمر صاف جھلکتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت دوم 1939ء، ص ۸

2۔ گربچن سنگھ طالب، بابا شیخ فرید، انڈیا، نیشنل بک ٹرسٹ، 1978ء ص ۸۱

3۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، 1995ء

4۔ میر تقی میر، نکات الشعراء، دہلی، جے کے آفسیٹ پرنٹرس، 1994ء ص ۱۵

5۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، کراچی، انجمن ترق اردو پاکستان اشاعت دوم، 1939ء، ص ۲۱

6۔ شبیر حسن چشتی نظامی، سیرت پاک خواجہ سید محمد گیسو دراز بندہ نواز، لاہور، عظیم اینڈ سنسز پبلشرز ۲۰۰۲ء، ص ۱۱

7۔ معراج العاشقین از گیسو دراز، مرتب: ڈاکٹر حفیظ قتیل، آندھر پردیش، انجمن ترقی اردو انڈیا ڈ 1944ء ص ۲۶

8۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۴۰

9۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، لاہور، اکبر بک سیلرز ۲۰۰۴ء، ص ۳۰۷

10۔ محمد ہاشم علی، میراں جی، حیدرآباد، شالیمار پبلشرز ۱۹۷۴ء، ص ۹

11۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۱۹۹۱ء ص ٦٧

12۔ ڈاکٹر حسینی شاہد، سید شاہ امین الدین اعلیٰ حیات اور کارنامے، آندھر پردیش، انجمن ترقی اردو انڈیا، ۱۹۷۱ء، ص ۳۷

13۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۵ء ص ۱۱٦

14۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۱۹۹۱ء، ص ۸۱

اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں محققین کے نظریات۔ایک جائزہ

زبان اردو کے مقامی اسماء اور علاقائی وابستگیاں کم از کم اس حقیقت سے تو پردہ اٹھاتی ہیں کہ اردو یہیں کہیں ہندوسندھ سے پھوٹی ہے۔

زبان اردو جیسی ہاضم بھاشا نے فارسی،عربی،ترکی،سنسکرت،انگریزی وغیرہ جیسی عظیم زبانوں کے سیکڑوں الفاظ گھول گھول کے پیے۔

سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں جو فہرست دی ہے اس کے مطابق زبان اردو میں ہندی کے (21646) عربی کے (7840) فارسی کے (6041) انگریزی کے 500 اور دیگر زبانوں کے (181) الفاظ شامل ہیں۔

حد تو یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کے الفاظ وتراکیب تک کو بعینہ اردو کا حصہ بنا دیا۔صم بکم،سکینہ انفاق،تبرج الجاہلیہ، براءۃ، الحمداللہ،علم الیقین وغیرہ اردو میں یوں استعمال ہوتے ہیں جیسے یہیں کہیں آس پاس کے ہوں۔

اسی طرح فرغل ،لبادہ ، قبا، چوغہ ، تکیہ، برقع (فارسی) نیلام (پرتگالی) کمرا (اطالوی) ریل اسٹیشن،سکول، بنک،گلاس، (انگریزی) چٹا کھبا،مٹی (پنجابی) اور بسکٹ فرانسیسی وغیرہ زبانوں سے زبان اردو میں یوں شامل ہوئے کہ ان کے غیر مقامی ہونے کی طرف بھولے سے بھی دھیان نہیں جاتا۔

زبان اردو (Buffer) سٹیٹ کی طرح شروع ہی سے معاونین اردو اور طرفدران ہندی کے مابین کھینچا تانی کا شکار رہی ہے۔اول الذکر فارسی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے اسے فارسی نژاد اور مئوخر الذکر اسے صرف نحو اور ہندی محاورات کی

کثیر موجودگی سے ہندی النسل ٹھہراتے آئے ہیں۔

حد تو یہ ہے کہ لفظ اردو کی Etamology تک متنازع فیہ امر رہا ہے۔ فارسی، ترکی، سنسکرت حتیٰ کہ فرانسیسی تک سے اس لفظ کے تانے بانے جوڑے جاتے رہے۔

بل کہ میں کہوں گا اصل نزاع ہی لفظ اردو کے کسی مخصوص معنی میں استعمال سے ہوا۔شاہ جہان آباد سے وابستہ ترکیب ''اردوئے معلیٰ'' ردو کے جنم کو کسی خاص دور اور خاص علاقہ سے منسلک کر کے کئی ماہرین و مورخین زبان نے نادانستہ ہی سہی ایک مناقشہ کو ضرور آن کھڑا کیا۔

حالاں کہ یہ لفظ کئی علاقوں بل کہ کئی ممالک کی زبانوں میں یکسر مختلف معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

ترکی کے صوبہ کا نام اردو ہے تو منگولیا میں یہی اردو شاہی محل کے مفہوم میں آیا ہے ویسے چینی شہر کاشغر کا قدیم نام اردو قند تھا۔ اطالوی میں اوردتو پولش فرانسیسی میں ہورد اسی لفظ کی قدیم شکل رہی ہے۔

یہ لفظ شاہ جہان کے ہاں آ کر اردوئے معلیٰ یعنی شاہی کیمپ بنا جس سے صاحب لوگوں کو گمان ہوا جیسے یہ زبان چھاونی میں پروان چڑھی ویسے ایسی فوجی چھاونیاں فاتحین کی زبان کو قبول کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی ہیں کہ کلام الملوک ملوک الکلام ۔غلط یہ بھی نہیں کہ شہروں اور علاقوں سے زبانیں منسوب ہوتی نہیں ۔ سندھ سے سندھی، بنگلہ دیش سے بنگلہ، پنجاب سے پنجابی حتیٰ کے ملکوں کے ناموں سے بھی منسوب ہوتی ہیں۔ جیسے پولینڈ سے پولش فرانس سے فرنچ۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ

انگریزی درجن بھر ملکوں کے قومی زبان ہوتے ہوئے بھی صرف انگلینڈ سے ہی نسبت رکھتی ہو۔

جب خان آرزو نے کہا تھا کہ ہم اردوئے معلیٰ والے لفظ ''چھنیل'' سے آگاہ نہیں تو دراصل ان کا اشارہ کسی اور زبان کی طرف تھا جو فارسی سے ہٹ کر تھی جسے ہم آج اردو سے موسوم کرتے ہیں۔ کیوں کہ اردوئے معلیٰ کی زبان فارسی تھی کہ مغلوں کی زبان یہی تھی۔ لہذا چھاؤنیوں کو Breeding Ground قرار دینا زیادتی ہوگی۔

ہندوی ہندی دکنی ریختہ سے ہوتی ہوئی یہ زبان اردوئے معلیٰ کے بھاری بھرکم ترکیب سے موسوم ضرور ہوئی لیکن یہ مرکب اصطلاح خود دوئی کی علامت ٹھہری اور جلد وحدت سے وابستہ ہوکر لسانی ماہرین کو بتلا گیا کہ زبان وحدت کی نشانی ہوتی ہے اس لیے زبانوں کے نام واحد ہی ہوتے ہیں

خوش نہاد زبان اردو کے خصائصِ اربعہ اس کے سندھ و ہند نژادی اصل کا ثبوت ہیں۔

1۔ ہندی فارسی عربی کی تمام آوازیں اس میں موجود ہیں۔

2۔حروف ہجا ان تینوں زبانوں کے حروف سے مل کر ہی بنے ہیں۔

3۔دوسری زبانوں کے الفاظ ومحاورات کواپنانے کی صلاحیت اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

4۔اوراس کا رسم الخط شروع سے فارسی رہا ہے۔

زبان کے حوالے سے چند بنیادی معروضات پیش کرنے کے بعد اس کی

ابتداء سے متعلق ماہرین زبان کے نظریات کا سرسری جائزہ لیتے ہیں گو یہ تمام نظریات بادی النظر میں ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں تاہم ان میں اشتراک کی گنجائش ضرور موجود ہے۔

محمد حسین آزاد۔۔۔۔۔۔۔برج بھاشا

محمد حسین آزاد اردو کا مرز بوم ''برج بھاشا'' قرار دیتے ہوئے'' آب حیات ''میں رقم طراز ہیں:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے''(۱)

برج کی زبان آگرہ دلی اور متھرا کے اردگرد کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ پھر آگرہ شہر کی تاریخی حیثیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ بابر، جہانگیر اور شاہ جہاں کا پایہ تخت یہی شہر رہا ہے یوں آگرہ کی مرکزیت سے برج بھی اہمیت کی حامل ٹھہری ہوگی آزاد مزید لکھتے ہیں:

''ہماری اردو برج بھاشا سے نکلی ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں ہے کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔''(۲)

شمس اللہ قادری اور عبدالغفور نساخ نے اس رائے کی توثیق کی ہے بعض لوگوں نے آزاد کی ہم نوائی میں اردو کو برج بھاشا کی دختر ٹھہرایا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے برج، پنجابی اور اردو میں ہم شیرگی کا رشتہ قائم کر دیا۔

ویسے آزاد سے قبل ایسے ہی خیالات کا اظہار ''باغ و بہار'' میں میر امن

دہلوی کر چکے تھے۔

آزاد کے نظریہ کو حافظ شیرانی ،مسعود حسین خان اور شوکت سبز واری نے لسانی اور تقابلی تجزیوں سے رد کر کے دونوں کے درمیان بُعد کی نشان دہی کی ہے۔

ان میں سے چند لسانی اختلافات حسب ذیل ہیں:

☆ برج بھاشا میں اسماء،افعال اور اسمائے صفات کا اختتام عموماً و/اوَ پر ہوتا ہے۔مثلاً اپنو۔چلیو۔گھوڑو وغیرہ اس کے برعکس اردو میں (ا) پر خاتمہ ہوتا ہے مثلاً اپنا۔چلا۔گھوڑا وغیرہ۔

☆ دونوں کے ضمائر میں بھی خاصا فرق ہے۔اردو کا تیرا اور تمہارا برج بھاشا میں تیرو اور تمہارو ہو جاتا ہے۔

☆ برج میں جمع بنانے کے لئے ''ن'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے ڈھونڈن۔روون۔

☆ اردو میں تا کے اضافے سے مضارع بنتا ہے جب کہ برج بھاشا میں صرف ''ت'' لگانے سے جیسے کرت۔آوت۔جاوت۔

ان اختلافات کی موجودگی میں برج بھاشا کو اردو ماخذ بتانا درست کیسے ہوسکتا ہے؟

نصیرالدین ہاشمی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دکن میں اردو

نصیرالدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اردو'' اردو لسانیات کی تاریخ مین اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ہاشمی صاحب کے مطابق مسلمان فتح سندھ سے بہت پہلے ہند سے روابط قائم کر چکے تھے۔بعض مورخین کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی

نبوت سے بھی پہلے سواحل ہند پر عربوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا۔

ڈاکٹر تارا چند نے بھی اپنی تالیف ''اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر'' میں عرب ہند تعلقات کی قدامت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

قرین قیاس یہی ہے کہ عرب تجارتی قافلوں سے لین دین کے معاملات کے نتیجہ میں ہند کے کئی مقامی لوگوں نے عربی الفاظ سیکھ لیے ہوں گے۔سونے پہ سہاگہ محمد بن تغلق نے 1326ء میں دکن کو قبۃ الاسلام قرار دے کر اپنے ساتھ اہل دلی کو بھی ہجرت کا حکم دے دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ تغلق کو کچھ عرصہ بعد غلطی کا احساس ہوا تو اس نے دلی مراجعت کر لی مگر مہاجرین دلی اس دوران دکن میں اپنی سماجی تجارتی تعلقات استوار کرنے کے موجب وہیں سکونت پذیر ہی رہے دکن کی مقامی بولیاں مرہٹی تامل تلگیو تو پہلے ہی عربی زبان سے مانوس ہو چکی تھیں اب فارسی نے بھی اثر دکھایا اور اردو کی مخصوص صورت کی تشکیل ہوئی۔

ہاشمی صاحب کی معروضات کو اس لیے بھی کئی محققین اردو نے تسلیم نہیں کیا کہ دکن کی بولیاں ملیالم، تامل اور کنٹر لسانی خاندان دراوڑی سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ ان محققین کے نزدیک اردو ہند آریائی زبان ہے تو کیسے دکن کی زبانوں اور عربی کے اختلاط سے اردو جیسی ہند آریائی زبان نے جنم لیا ہوگا؟

ہاشمی نے خود کوئی مربوط نظریہ نہیں دیا اور وہ خود بعض مقامات پر الجھن کا شکار نظر آتے ہیں۔اسی کتاب میں وہ صفحہ نمبر 19 پر لکھتے ہیں:

''جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع ہوتے ہیں اس لئے ہم دکن کو بھی اردو کا مولد قرار نہیں دے سکتے'' (۳)

ہاشمی صاحب کو اردو صرف دکن میں ہی پروان چڑھتی نظر آتی ہے اور اسی با ت کا شکوہ جالبی صاحب کو ان سے ہے۔ڈاکٹر جالبی رقمطراز ہیں:

''دکن میں اردو ہو یا پنجاب میں اردو ان کی مثال تاریخ کی کتابوں میں ایسے ہے جیسے جسم کے ایک حصہ کو بیان کیا جائے اور باقی جسم کو چھوڑ دیا جائے۔''(۴)

ہاشمی صاحب کی تحقیقی کاوش کے بعض نقائص اپنی جگہ مگر ایک مخصوص علاقہ سے متعلق ایسا لسانی مواد ایک جگہ پر جمع کر دینا فی نفسہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور اسی محنت کی داد انہیں مسعود حسن رضوی ادیب نے ان الفاظ میں دی ہے:

''بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ مئولف نے اس کی تالیف میں کس قدر محنت کی ہے اور کس قدر معلومات کو یکجا کر دیا ہے''

سید سلیمان ندوی۔۔۔۔۔۔۔۔سندھ میں اردو

سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں اردو کی پیدائش فتح دیبل کے ساتھ مسلمانوں کی آمد سے منسوب کی ہے۔مسلمانوں کا پہلا پڑاوٴ چوں کہ سندھ تھا لہذا وہ الفاظ اردو کے سرمایہ میں عربی و فارسی الفاظ کی کثرت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو کا ہیولیٰ وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔تاہم ان کے اس قیاس کو شہادت ایسے میسر نہیں آئی کہ سندھ کے علاقے میں سندھی زبان بولی جاتی تھی اردو نہیں لامحالہ عربی کے اثرات سندھی پر پڑے ہوں گے کہ موجودہ سندھی کے نا صرف کثیر الفاظ عربی الاصل ہیں بل کہ سندھی کا رسم الخط بھی عربی ہے۔

سید صاحب سندھی، ملتانی اور پنجابی کے الفاظ کے اشتراک کو فارسی و عربی کے میل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک ملانی سندھی اور دہلی کی مقامی بولیاں

عربی وفارسی کے اختلاط سے جس زبان میں تبدیل ہوئیں اسے آج اردو کہتے ہیں۔

سندھی اور اردو کے اس قرب کے باوجود جس کا ذکر ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے اپنی کتاب ''سندھ میں اردو'' میں کیا ہے ہنوز یہ امر تحقیق کا محتاج ہے کہ آیا وہ بولی سندھی ملتانی یا دہلی کی کوئی مقامی بولی ہی تھی یا دکن ہندی یا سنسکرت کی کوئی بھانجی بھتیجی تھی؟

ہم پنڈت کیفی کے الفاظ میں اس نظریہ کو سندھ کا قضیہ تو قرار نہیں دے سکتے البتہ سوال وہیں پر موجود ہے کہ محمد بن قاسم کے سندھ حملہ سے قبل دکن اور اس کے گرد و نواح میں سیکڑوں مسلمان خاندان آباد ہو چکے تھے تو سید سلیمان ندوی کے اس مفروضے کی بنیاد پر ہمیں دکن کو اردو کی جنم بھومی قرار دینا ہوگی۔

گو سید سلیمان ندوی نے اپنے اس نظریہ سے اپنے مضمون ''اردو کیوں کر پیدا ہوئی'' جو معارف جولائی 1932 میں چھپا تھا۔ رجوع کر لیا تھا تاہم بعض لوگوں نے ان کی بات کو وحی الہی سمجھ کر پوری پوری کتابیں تصنیف فرمادی ہیں۔

حافظ محمود شیرانی۔۔۔۔۔۔۔۔پنجاب میں اردو

یہ بات یقین سے تو نہیں کہی جا سکتی کہ حافظ شیرانی نے ''دکن میں اردو'' از ہاشمی کے ردعمل میں تصنیف فرمائی یا اعجاز سخن از شیر علی سرخوش سے خوشہ چینی کی یا اقبال کے اس قول سے کہ

> ''پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔اگر اس کے جمع کرنے میں کسی
> کو کامیابی ہوئی تو مؤرخ اردو کے لئے نئے سوالات پیدا ہوں گے''

سے اشارہ پا کر پنجاب میں اردو کے آغاز کا نظریہ دیا۔محرک کوئی بھی رہا ہو بہرحال اتنا جامع مربوط اور مبسوط کام اردو لسانیات کے ضمن میں ان سے پہلے نہ ہوا

تھا۔

یہ ایک ایسا عہد آفرین نظریہ تھا جس کی گونج آج بھی تحقیق کے میدانوں میں سنائی دیتی ہے۔ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے تو رشید حسن خان جیسے وہابی محقق نے ان کو تحقیق کا معلم اول گردانا ہے۔

حافظ صاحب کے نظریے کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جس زبان سے اردو ارتقاء پذیر ہوئی وہ برج ہے نہ ہریانی بل کہ وہ زبان جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی ہے یہ وہی زبان ہے جو پنجاب سے مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے دہلی پہنچی ہے۔دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں سے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔پنجابی اور اردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔اس کے تذکیر و تانیث اور جملے اور افعال کی تعریف کا اتحاد اسی نتیجے کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے و دنوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی تب ان میں جدائی واقع ہو گئی۔

حافظ شیرانی کے نظریہ کی تردید مسعود حسن خان مقدمہ تاریخ زبان اردو میں یہ کہ کر کی ہے کہ جو خصوصیات شیرانی صاحب نے پنجابی کی بتائی ہیں وہ ہریانوی میں موجود ہیں۔گو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مسعود صاحب سے اختلاف کیا ہے کہ ہریانوی اردو کے بعد کی زبان ہے۔اسی طرح ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنی تصنیف ''حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات'' جلد اول میں مسعود صاحب کی تحقیق کا

ردان الفاظ میں کیا ہے کہ

''مسلمان مغربی پنجاب سے جو بولی لے کر آگے بڑھتے ہیں وہ راجستھانی اور پہاڑی بولیوں کا یہ تعلق منقطعکر دیتی ہے اور اس نئی بولی کے ہریانہ کی مروجہ راجستھانی پر اثر انداز ہونے کے نتیجے میں جو بولی ظہور میں آئی ہے وہ ہریانی ہے اس بنا پر ہریانی کو مسلمانوں سے پہلے کے دور میں تلاش کرنا لات ہے لہذا مسعود صاحب کو قدیم اردو (دکنی) میں جو ہریانی میں نظر آتا ہے وہ درحقیقت اس کا پنجابی پن ہے۔'' (۵)

البتہ حافظ شیرانی نے اس بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیا کہ اگر پنجاب میں اردو پیدا ہوئی تو پھر وہ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان کیوں نہ بن سکی۔ یہاں کے عام لوگوں کی بولی پنجابی ہی کیوں رہی حالاں کہ یہ سارا علاقہ محمود غزنی کے حملہ کے دوران میں یعنی 18 ویں صدی عیسوی یعنی 800 برس تک مسلمانوں کے تسلط میں رہا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان

ڈاکٹر مسعود حسین خان کا دعویٰ ہے اردو دہلی کے نواحی علاقہ میں پیدا ہوئی۔ ان کی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو 1948ء میں شائع ہوئی جس میں انہوں نے اس دعویٰ کے حق میں اپنے دلائل شدومد کے ساتھ پیش کیے۔

ان کے مطابق قدیم اردو کی تشکیل ہریانی کے زیر اثر ہوئی اس پر کھری بولی کے اثرات پڑتے رہے 15 ویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام طور پر مقبول ہوجاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوئی ہے۔

نواح دہلی کی بولیاں (ہریانی کھری اور برج) اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور حضرت دہلی اس کا صحیح مولود ومنشا لیکن ایک زبان کے طور پر اردو کی ابتداء اس طرح ممکن ہوسکی جب مسلمانوں نے دہلی پر اقتدار حاصل کرلیا۔

اس نظریہ کی بھرپور تردید ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس الفاظ میں کی کہ مسعود خان صاحب سے اہم فروگذاشت یہ ہوئی کہ انہوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کے تقابل قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کیے حالاں کہ جس وقت پنجاب میں اردو کا ارتقاء عمل میں آیا اس وقت ہریانی اور کھڑی بولی تو کجا برج بھاشا بھی ایک جداگانہ وجود نہیں رکھتی تھی۔

مزید براں ان کا کہنا یہ ہے کہ

''قدیم دکنی اردو اور ہریانی میں بعض لسانی اشتراک سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اردو ہریانی سے بنی بل کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو اور ہریانی دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔''(٦)

ڈاکٹر شوکت سبزواری۔۔۔۔۔۔ویدک بولی

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ہندوستان کی بولیوں کا صرفی نحوی اصولوں اور صوتی تبدیلیوں کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اردو قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کر کے اس حالت کو پہنچی ہے ان کے مطابق یہ بولی میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی معیاری شکل تھی۔ پالی فن وادب و فلسفہ کی زبان ہے جب کہ اردو عوامی زبان ہونے کی وجہ سے ارتقاء کرتے کرتے موجودہ شکل میں ہمارے سامنے آموجود ہوئی شوکت سبزواری اور سہیل بخاری دونوں نے پنجاب کو نظرانداز کر کے اپنے ''دلی سامراج'' کا ثبوت دیتے ہوئے نواح دہلی و

دہلی کو مرکزی حیثیت دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

دہلی اور اس کے نواح کی مرکزی حیثیت کی وجہ سے وہاں اردو کی نشوونما اور ارتقاء ماننے میں دقیقہ نہیں تاہم وہاں سے اردو کے جنم پر مہر ثبت کرنا درست نہیں ہے۔

اپنے ایک مضمون ''اردو کی لسانی تاریخیں'' میں مرزا خلیل احمد بیگ نے شوکت سبزواری کی تحقیق پر یوں سوالیہ نشان کھڑے کیے ہیں۔

''شوکت سبزواری کی یہ عجیب منطق ہے کہ شورسینی اپ بھرنش سے ارتقاء پانے والی قدیم ہندی (قدیم کھڑی بولی) کو چھوڑ کر قدیم ہند آریائی عہد کی بولیوں کو گرفت میں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اردو انہی بولیوں میں سے ایک ہے وہ پالی کو اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل بتاتے ہیں۔ سبزواری نے اردو کے آغاز کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ بہت مبہم الجھا ہوا اور ایک لحاظ سے غیر منطقی ہے۔ وہ اردو کا آغاز پراکرت اور پالی میں تلاش کرتے ہیں بل کہ ویدک عہد تک پہنچ جاتے ہیں جو بے سود ہے۔ اردو کا آغاز اس وقت سے ماننا ہوگا جب سے اس زبان کی لسانیاتی خصوصیات ابھرنا شروع ہوتی ہیں۔''(۷)

ڈاکٹر سہیل بخاری۔۔۔۔۔۔اردو ویدک بولی

ڈاکٹر سہیل بخاری نے رِگ وید میں اردو الفاظ کی موجودگی سے یہ قیاس کیا ہے کہ یہ بھاشا کے طور پر اس خطہ میں رائج رہی ہے ان کے بقول اردو کا کینڈا مسلمانوں کی آمد سے منسوب نہیں اور نہ ہی اس کا آغاز اور ارتقاء کا ان سے کوئی تعلق ہے ان کے نزدیک ہندوستان کی ساری بولیوں کی مانند اردو بھی ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے قبل بھی بولی جارہی تھی۔ ہاں اس کی لپی بدلتی رہی ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہ دیوناگری لپی میں لکھی جاتی تھی البتہ مسلمانوں کی آمد سے یہ فارسی یا

عربی لیپی میں لکھی جانے لگی جس سے ان کے بقول:

''ہمارے عالموں کو دھوکہ ہو گیا کہ اردو ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے پر جنمی ہے'' (۸)

ڈاکٹر سہیل بخاری کے اس انوکھے استدلال پر ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے:

''ڈاکٹر سہیل بخاری جیسا محقق اس عام حقیقت سے کیسے صرف نظر کر گیا کہ زبانوں یا رسم الخط میں تغیرات یا انجداب کے سلسلے بجلی کا سوئچ آف یا آن کرنے کی مانند اچانک معرض وجود میں نہیں آجاتے بل کہ یہ طویل زمانی عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں نہ کہ ''جس دن سے لوگ'' کی مانند فوری طور پر ہی رسم الخط میں تبدیل ہو گئی'' (۹)

ڈاکٹر سہیل بخاری اردو کو مہاراشٹر جتھے کی بولی قرار دیتے ہیں انہوں نے اردو کی جنم بھومی مشرق میں اڑیسہ اور جنوب میں تلنگانہ بتائی ہے۔

کئی ماہرین اردو سہیل بخاری کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے کہ اردو غیر آریائی زبان ہے۔

عین الحق فرید کوٹی۔۔۔۔۔۔دراوڑی اور منڈا زبانیں

عین الحق فرید کوٹی نہ صرف شیرانی (پنجابی اردو کا ماخذ) بل کہ سہیل بخاری (رگ وید) سے بھی پیچھے ماضی کے دریچوں سے اردو کی مرز بوم تلاشتے نظر آتے ہیں۔

عین الحق فرید کوٹی نے دراوڑی اور منڈا زبانیں اردو کا ماخذ بتائی ہیں۔ان کی تحقیق کے مطابق دراوڑ یہاں کے مقامی باشندے تھے جو آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں آباد تھے اور منڈا قبائل دراوڑوں کے بھی پیش رو تھے جو افریقہ ملیشیا سے یہاں آباد ہوئے اور جو منڈا زبانیں بولتے تھے۔

نہ صرف براہوی زبان دراوڑی زبان کی باقیات میں سے ہے بل کہ سندھی اور پنجابی بھی بقول رشید افسر ندوی کسی ایسی زبان سے نکلی ہیں جس کے بولنے والے تورانی الاصل تھے جو پانچ ہزار قبل مسیح سندھ و بلوچستان کے خطوں میں آباد ہوئے۔

اسی تناظر میں فرید کوٹی نے اردو زبان کی قدیم تاریخ میں لکھا ہے:

''جب ہم اردو زبان کی صرف ونحو کا پنجابی اور برج بھاشا کی صرف ونحو سے موازنہ کرتے ہیں۔تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔کہ جہاں اردو اور پنجابی کے درمیان گہرا رشتہ موجود ہے۔وہاں اس کے برج بھاشا کے اختلافات کی خلیج وسیع ہے''(۱۰)

عین الحق کے نزدیک اردو زبان کی صرف ونحو فارسی اور سنسکرت دونوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ اردو اور سنسکرت میں لغوی اشتراک کی وجہ سے یہ یک طرفہ فیصلہ نہیں دیا جا سکتا کہ الفاظ کا یہ سرمایہ سنسکرت نے اردو کو دیا ہے بل کہ معاملہ اس کے برعکس یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ خود سنسکرت نے یہ الفاظ اردو ہی کی پیشرو زبانوں سے اخذ کیے ہوں۔انہوں نے اردو کے لغوی سرمایہ اور صرف ونحو کا موازنہ برصغیر کی موجودہ زبانوں سے کر کے یہ ثابت کیا کہ اردو زبان کے سب سے زیادہ نزدیک پنجابی ہے کیوں کہ صرف ونحو کے لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اردو سے اتنی گہری مطابقت نہیں رکھتی عین الحق فرید کوٹی مزید رقمطراز ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیادیں وادئ سندھ میں استوار ہوئیں اور اس کا سلسلہ نسب پنجابی اپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا ہڑپائی عہد سے جا ملتا ہے جو آریاؤں کی آمد سے قبل وادی سندھ میں رائج تھا''(۱۱)

عین الحق فرید کوٹی کے نزدیک چونکہ منڈا قبائل ہی یہاں کے قدیم ترین

باشندے تھے و دراوڑوں سے بھی پہلے یہاں آباد تھے لہذا آمری نال تہذیب جو منڈا قبائل کی مرہون منت تھی اور منڈا قبائل کی زبانوں کا یہاں چلن تھا لہذا ان کے استدلال کی رو سے دراوڑی زبان ہی اردو اور پنجابی کی ماخذ ہے۔ اس نظریے کی حمایت میں ڈاکٹر وزیر آغا کا استدلال جوان کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' میں ہے بھی قابل غور ہے کہ

''وادئی سندھ کی تہذیب کی لپی دائیں سے بائیں جانب کو لکھی گئی ہے'' (۱۲)

ڈاکٹر انور سدید کے مطابق عہد اشوک کے بعض کتبے ایسے ملے ہیں جو دائیں سے بائیں لپی میں لکھے گئے تھے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ لپی ابھی پوری طرح پڑھی نہیں جاسکی لیکن نکتہ قابل غور ہے۔ کہ اس زمانے میں برصغیر میں ایک ایسی لپی اسی انداز میں لکھی جانے والی زبانیں عربی اور فارسی اس ملک میں آئیں تو ان کی اطراف تحریر نے بھی قبولیت عام میں مدد دی ہوگی'' (۱۳)

خاطر غزنوی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہندکو

اردو مؤرخین کے ہاں شروع ہی سے اردو زبان کو کسی خاص خطہ سے منسوب کرنے کا رجحان غلب رہا ہے خاطر غزنوی کی کتاب ''اردو زبان کا ماخذ ہندکو'' 2003ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس میں انہوں نے ہندکو اور پنجابی کو اردو سے قدیم زبان قرار دیا۔ وہ قمطراز ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ پنجابی اور ہندکو کا رشتہ بہنوں کا ہے ماں بیٹی کا نہیں یعنی سندھ کو یعنی ہندکو اپنے وسیع تر دائرے میں اس سارے وسیع علاقے کی اس رائج زبانوں کا حصہ ہے جس کی بنیاد پر پنجابی اور ہندکو بلاشبہ اردو سے قدیم

ترین ہیں اور اس علاقے کی اصل زبانیں ہیں جو دریائے سندھ کے دونوں کناروں اور اس سے مشرق کی جانب انبالہ تک رائج ہیں اور جن کے اثرات شمال مغرب کے لوگ برصغیر سے لے کر گئے بل کہ جنوبی ہند یا دکن تک پہنچے اور جن کی گونج آج بھی دکنی زبان و ادب کی تاریخ میں محققین کو سوچنے پر مجبور کرتی رہی ہے کہ ان زبانوں میں حیرت انگیز مماثلت کا سبب کیا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دریائے سندھ کے دونوں کناروں کی زبان دریائے سندھ کی وادی کی تہذیب اور تمدن کا حصہ اور حقیقی وارث ہے اور آریاؤں کی آمد سے پہلے سے برقرار ہے۔ اور سنسکرت کی طرح اس پر مردہ زبان کا کوئی دور نہیں آیا۔ یہ قطعی طور پر ہند آریائی زبان نہیں یہ وادی سندھ کی اولین زبان ہے اور خالصتاً سندھ کو یا ہندکو ہے۔ ہندی بھی اس کی بیٹی ہے اور اردو بھی''(۱۴)

گو خاطر غزنوی سے قبل ایسی آراء کا اظہار مختار علی نیئرؔ اور فارغ بخاری بھی کر چکے تھے تاہم خاطر کا کام ایک مربوط اور مبسوط تحریری شکل میں سامنے آیا۔

ہندکو جو ہند آریائی زبان ہے خیبر پختون خواہ اور پنجابی کے کئی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ ہندکو مغربی پنجابی کی بولی ہے جسے لہندا بھی کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اطراف تحقیق میں لکھا ہے کہ ہندکو کے لاکھوں بولنے والے ہزارہ ڈویژن پشاور کوہاٹ بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان وغیرہ میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ناشاد خاطر غزنوی سے ہندکو کی علاقائی تقسیم سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خاطر نے غیر منصفانہ طور پر ہندکو کو سندھ اور بلوچستان تک پھیلا دیا ہے۔

ڈاکٹر ناشاد نے لکھا ہے کہ

''ہندکو سندھ دریا کے قریب بسنے والوں کی زبان تھی ان کو ہندکو بھی کہا جاتا تھا۔''(۱۵)

مندرجہ بالا ان سب نظریات میں سے جو نظریہ اردو زبان کے تولد کو سب سے قدیم دور اور سب سے قدیم زبان سے منسوب کرتا ہے وہ یقیناً عین الحق فرید کوٹی کا نظریہ ہے جو اردو کو منڈا قبائل کی زبان دراوڑی کی ہی ایک بولی قرار دیتا ہے جو آفزائش وزیبائش کے عمل سے گزرتی ہوئی موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔اور چوں کہ ان سارے نظریات میں کوئی نہ کوئی جزوی صداقت موجود ہے لہذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آریاؤں کی آمد سے بھی پہلے مقامی منڈا قبائل جو قدیم ہرپائی تہذیب سے بھی چھ ہزار سال قبل مسیح یہاں آباد تھے ان کی دراوڑی زبان کی مقامی بولی نے (جو ہندی اور پنجابی کی بھی ماں ہوگی) نے یہاں جنم لیا۔اس بولی کو آریاؤں نے نیا ذخیرۂ الفاظ فراہم کی اس کے بعد مسلمان حملہ آوروں کی سرپرستی میسر آنے سے فارسی وعربی وترکی زبانوں کا اختلاط ہوا سندھ ودکن وپنجاب جیسے سیاسی وتہذیبی مراکز سے فیض یاب ہوکر یہ بولی خطہ بھر کی Lingua Franca بن گئی۔

متذکرہ بالا نظریات کا بظاہر ایک دوسرے سے تضاد کا علاقہ ہے تاہم ان سب میں کسی نہ کسی طور جزوی صداقت ضرور موجود ہے یوں ان نظریات میں سے کلیتاً نہ تو کسی کی تردید کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کسی ایک پر دوسرے کو خصوصیت سے ترجیح دی جاسکتی ہے۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''یہ نظریات اپنے تضادات انتہا پسندی یا خامیوں کے باوجود بھی مختلف رنگوں اور وضع کے ان شیشوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو انفرادی

حیثیت میں تو چاہے کچھ بھی نہ ہوں لیکن مل کر جب ایک Mosaic
کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو پھر اردو زبان یا اردو کی زبان کی ایک تصویر
بن جاتی ہے۔ یہ تصویر مکمل نہ سہی اور اس میں قطعیت کا فقدان بھی تسلیم لیکن
اس کے رنگین ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔''(۱۶)

اردو نہ ایرانیوں کا دین ہے نہ تورانیوں اور نہ یونانیوں کا یہ یہاں کہ مقامی زبان تھی جس نے بقول شان الحق حقی تین عظیم زبانوں کا دودھ پیا ہے سنسکرت عربی اور فارسی اس لیے اس کی ہمہ گیری وسعت اور مٹھاس بے مثل و بے مثیل ہے۔

حوالہ جات

1۔محمد حسین آزاد، آب حیات، نول کشور پرنٹنگ، ۱۹۰۷ء، ص ۶

2۔ایضاً

3۔نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دکن، نظام دکن پریس ۱۹۲۵ء، ص ۱۹

4۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۵ء

5۔ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء ص

6۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور، اردو کی ابتداء مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ) ص ۲۷

7۔مرزا خلیل احمد بیگ، اردو کی لسانی تاریخیں، مشمولہ: سہ ماہی فکر و تحقیق، دہلی، قومی کونسل برائے فرغ اردو زبان، اپریل جون ۲۰۲۱ء

8۔ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کا روپ، لاہور، کنول آرٹ پریس، ۱۹۷۱ء، ص

9۔ڈاکٹر سلیم اختر، اردو زبان کیا ہے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۶۷

10۔عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ،

11۔ایضاً ص ۹۶

12۔ڈاکٹر وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، لاہور مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۵
13۔ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۱۹۹۱ء، ص ۴۷
14۔خاطر غزنوی، اردو زبان کا ماخذ ہندکو، اسلام آباد، نیشنل لینگویج اتھارٹی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۵۔۱۵۶
15۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، اطراف تحقیق، راولپنڈی، الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص
16۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء ص ۸۱

تنہائی اور گوشہ نشینی

کشور ناہید کے مطابق تنہائی دو دھاری تلوار ہے جس کی ہیبت سے بعض اوقات دشمن کو بھی زندہ رکھنا پڑتا ہے۔اور سر سید کے چچا غالب نے فرمایا ہے۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کالانا ہے جوئے شیر کا

مغربی ادب نے بھی تنہائی کے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے جہاں ارسطو نے کہا Man without society is either a beast or a god تو وہیں فرانسس بیکن نے اس قول سے خوشہ چینی کرتے ہوئے ارسطو کے انسانِ درندہ کو وحشی درندہ قرار دیا ہے۔

Whoseever is delighted in solitude is either a wild beast or a god

جو چاہے ''ان'' کا حسن کرشمہ ساز کرے۔''معلم اول'' نے انسان کو سماجی حیوان کہا تو کارل مارکس نے معاشی حیوان سے ملقب کردیا۔سماجیات ہوں یا

معاشیات دونوں اصل ایک ہی ہے ۔۔تبادلہ خیال ،اشتراک عمل،تعاون ووابستگی،تفاعل وموانست، روحانی وجسمانی ضروریات کی تکمیل ۔۔۔یہی سب ہی سماجیات ومعاشیات کے وظائف ٹھہرتے ہیں۔

گو بعض انگریز ادیبوں نے Lonliness اور Solitude میں فرق روا نہیں رکھا تاہم ان دونوں الفاظ کا باریک سا فرق ختم نہیں ہوجاتا۔۔وہی فرق جو اردو میں سخی وجواد میں پایا جاتا ہے۔Lonliness کی لیے تنہائی اور Solitude کے لیے گوشہ نشینی درست اردو مترادفات ہیں۔تنہائی جہاں نفسیاتی و ذہنی پیچیدگیوں کا باعث بنتی ہے وہیں غار حرا کی گوشہ نشینی عرفان ذات کا سبب اور آبادیوں سے دور شجرِ پیپل ستیارتھ کا گیان قرار پاتا ہے۔مریم کا حجرہ ہو یا موسیٰ کا قیام سینا،عبدالقادر کا جنگل ڈیرہ۔یا پھر بابا فرید کا چلا۔۔۔یہ سب مقصد اعلیٰ و اولیٰ کے حصول کے لیے نا گزیر ہونے کی وجہ سے یا قابل مذمت ہیں نہ قابل گرفت (معاذ اللہ)۔ان سب کا رہبانیت،ترک دنیا اور مردم آزادی سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔

* جب آپ کو خود سے دور کر دے تو یہ تنہائی (Lonliness) اور جب آپ اپنی مرضی سے معاشرے سے صرف اس لیے دور ہوئے ہوں کہ اپنی صلاحیتوں ،مہارتوں کو جلا بخش کر دوبارہ اسی معاشرے میں اسی معاشرے کی اصلاح کے لیے لوٹ آئیں تو یہ گوشہ نشینی (Solitude) کہلاتی ہے۔

گوشہ نشینی دراصل مجالس سے دور رہ کر مجلسی آداب سیکھ کر مجالس کو ارفعیت بخشنے کا گر ہے۔اور اگر گوشہ نشین اس دوران اس قابل نہیں ہو پاتا تو اس گوشہ نشینی سے تنہائی بدرجہ اولی افضل ٹھہری۔کیونکہ Loneliness is next to

بات اتنی سی ہے کہ تنہائی آپ کو خدا سے قریب کرتی ہے اور گوشہ نشینی godliness سے آپ خدا سے قریب ہو کر اس کی مخلوق کو اس سے قریب کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

فردیاتِ عاصم بخاری

فردیات عاصم بخاری کا ۱۸واں شعری پراؤ ہے لیکن وہ ہیں کہ تھکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ گویا آتش زیر پا ہے یا نصیحت آتش پر عمل کرتے ہوئے پاؤں تھکتے ہیں تو سر کے بل چلنا شروع کر دیتے ہیں۔

عاصم کی شرافت و نجابت کا زمانہ شاہد ہے لیکن مجھے ان کے ''واحد اثم شعر گوئی'' کا بھی علم ہے پر صد شکر کے ان کے ''اعصابِ سخن'' پر بقول اقبال عورت سوار نہیں ورنہ یہ ''نقصِ خاصہ'' ان کی جملہ صلاحیتوں کو دیمک لگا چکا ہوتا اور یہ متنوع اور منفرد مضامین شعری ان کی شاعری سے عنقا ہوتے جیسا کہ چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر میانوالی کے اکثر شعراء ابھی تک ''مطافِ لب و رخسار'' کا طواف کر رہے ہیں۔

اسی بات کا رونا شورش کاشمیری ''شب جائے کہ من بودم'' میں عربوں کے حوالے سے یوں روتے نظر آتے ہیں:

''عرب اپنے سوا ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہتے ہیں۔ ان کی لسانی نزاکتوں سے کاملاً آگاہ نہ ہونے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں اب بھی اعتماد ہے اور شاید اب بھی دنیا کو جو ان سے باہر ہے گونگا سمجھتے ہیں لیکن ان کی ذہنی رگوں سے جس طرح لہو نچڑ رہا ہے اور ان کے دماغ کے سوتے جس تیزی سے خشک ہو رہے وہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی عقلیں گنگ ہو گئی ہیں ان کے الفاظ عرب ہیں ان کی افکار عرب نہیں وہ اپنی روایتوں کو بھی اسی کے سہارے زندہ کر رہے ہیں اور شمشیر و سناں و

طاؤس و رباب میں داخل ہو رہے ہیں جدہ اس کا سر آغاز ہے''۔

اور کچھ ایسی شکایت کلیم الدین احمد کو صف اوّل کے اردو شعراء کی ''متاع قلمی'' اور ''اجناس شعری'' سے ہے۔جس کا جواب بجائے ''دلائل حقا'' سے دینے کے بجائے اس کی ''اقلیم سخن'' کو مغرب زدہ کے القاب سے نوازا جاتا رہا۔اسی مرِعوب مغرب نے اسی تصنیف (اردو شاعری پر ایک نظر) میں غالب و اقبال کے قصائد خاقانی بھی پڑھے ہیں اور فن داستان گوئی۔جیسی کتاب لکھ کر اپنی ''مشرق آزاری'' کا بارِثبوت بھی دیا ہے۔

کلیم الدین کو شکوہ درآمدی پرزوں کی کثرت سے ہے۔شعراء کے تخیئل مستعار نے تخلیئہ وافرہ کی موجودگی میں ایسے پودوں، پھولوں اور پھلوں کو پروان چڑھایا جن کی نشوونما کے لیے یہ زمین سازگار تھی ہی نہیں اور ان کے پیش کردہ طائران لاہوتی، فواکہ، ترکاریاں حتیٰ کہ علامتیں، تشبیہیں، استعارے اور مضامین تک ''مستعار من الفارس'' تھے۔اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر جس طائر مضمحل کو بلبل ۔۔۔سمجھ کر پنجرہ تخیل میں مقید بناتے آئے ہیں وہ بلبل ہے ہی نہیں۔۔۔۔اس غریب کو ''قفس رنگ'' کہتے ہیں۔

میانوالی کا آسمان سخن جہاں اضاف سخن کے دیگر نجوم ہائے رخشندہ سے محروم رہا ہے وہیں ''فردیات'' کی چیز دگر کو بھی ''شجر ممنوعہ'' سمجھ کر ''لاتقربا'' کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے محبوب لاشریک غزل سے خود کو استوار رکھا۔

لغزش پا میں ہے پابندی آداب ابھی

عاصم بخاری جہاں میانوالی میں سب سے زیادہ تخلیقات کے خالق کا اعزاز

رکھتے ہیں وہیں فردیات کی پہلی تصنیف کے خالق بھی قرار پاتے ہیں اور اسکا سہرا راقم الحروف کے سر بھی جاتا ہے کہ یہ ناچیز ہی اس تصنیف لطیف کا محرک بنا ہے۔

مجھے کچھ زیادہ خوشی اس لیے بھی ہو رہی ہے کہ نور سے دور سیہ رات مضافات میں (مظہر نیازی) زندہ رہنا بھی محال ہے یہ علاقہ اب بھی اسلام آباد و لاہور سے ۱۰۰ برس پیچھے ہے جو خود لندن، نیویارک سے اتنے برس چھوٹے ہوں گے۔ جہاں ضلع بننے کے پورے 111 برس کسی یونیورسٹی کا کیمپس بنا ہو جو پورے کا پورا visiting Lecturers کے وزٹس پر چل رہا ہو وہاں تعلیم۔۔۔ترقی۔۔۔جدت۔۔۔

حَتّٰی یَلِجَ الجَمَلُ فِیْ سَمِّ الخیاط (اعراف)

عاصم بخاری ایک سچا سُچا ادب شناس اور سخن پرور ہے اور اس کی نجی زندگی اور گھریلو حالات کا ذاتی شاہد ہونے کی وجہ سے مجھے معلوم ہے کہ یہ مسیحا حالات کی سولی پر کب کب مصلوب ہوا ہے۔ کب کب اس نے ''رفع الی السماء'' اور کب کب ''نزول الی الارض'' کیا ہے۔ گویا سب سے زیادہ ''فردیات'' تصنیف کرنے والے (4 کتابیں) عارف عبدالمتین کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے۔

سج گئیں میری کتابیں ہر دکان کے شیلف پر
اور عارف میرے بچے گھر میں بھوکے ہو گئے

اور اس ایثار کے بعد عاصم کو یہ شکوہ بھی ہے۔

الماریوں میں ہی سجی رہتی ہیں یہ فقط
پڑھتا نہیں کتاب کوئی المیہ ہے یہ

(عاصم بخاری)

مگر کیا جائے شاعری کی زلف گرہ گیر چیز ہی ایسی ہے کہ جو اس عشق کا اسیر ہو گیا وہ دنیا و مافیھا سے بے گانہ ہو گیا۔

بقول حافظ شیرازی

عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است
عاقلان دیوانہ گر دند از پی زنجیر ما

لیکن جس نے اسی کاروبار بنایا بلکہ عین حیات جانا وہ امر ہو گیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شاعری عاصم بخاری کے لیے عرفان ذات کا دوسرا نام ہے۔ یہ اس کی تنہائیوں کا یاور آلام کا مونس اور آزار کا مسیحا ہے۔ جب انہیں دل کا خالی مکان کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے تو وہ شاعری کی شمعیں جلا کر صحیفہ ذات کو پڑھنا شروع کر دیتے ہے۔

شاعری میری ہے آئینہ میرا
دیکھتا ہوں اس میں اپنے خدو خال

غالب نے کہا تھا۔

''جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی دیدہ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے''

شاعر سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ اس کی دوربین نگاہیں افق کے پار بھی دیکھ سکتی ہیں وہ ۱۸۰ درجے تک بآسانی چیزوں کو ملاحظہ کر سکتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے پہلے Pre-empt کر سکتا ہے جو چھٹی حس سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ اقبال کے الفاظ میں دیدہ بینائے قوم ہے۔ اسی لیے وہ جو دکھائے گا زمانہ وہی دیکھے گا۔

عاصم بخاری اپنے عہد کے دیگر علاقائی شعراء سے ہٹ کر سوچتا ہے اس نے غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کو بھی حرز جاناں بنا رکھا ہے۔اس کی محبت کسی فردِ واحد تک محدود نہیں بلکہ علاقہ کو محیط ہے۔

ے جن کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے ہر ایک کا دل عاصم
قدآورو سرخ سفید میانوالی کے گھبرو

ے تری آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اس کا نام لینے سے
تجھے اپنے علاقے سے عاصم بڑی محبت ہے

ے یاد آتی ہے بو کائن اور شہتوتوں کی چھاؤں
شہر کے AC کمروں میں بھی بھول نہ پاؤں گاؤں

عاصم بخاری نے ایک دن مجھے کہاں کہ میں ''گردش آیام'' کے نام سے آپ بیتی لکھنے کا اردہ رکھتا ہوں۔میں نے کہاں جناب میں وہ تو نہیں کہہ سکتا جو خوشونت سنگھ نے امرتا پریتم کو کہا تھا کہ'' تمہاری سوانح کا کیا ہے بس ایک حادثہ! لکھیں تو رسیدی ٹکٹ کی پشت پر درج ہو جائے''۔

لیکن اگر آپ کی 18 مطبوعات آپ بیتی نہیں تو بقول ساقی فاروقی پاپ بیتی ہیں؟۔

ہاں کنور مہندر سنگھ سحر کی 19 ابواب پر مشتمل سوانح حیات ''یادوں کا

جشن'' سے مقابلہ مقصود ہے تو اپنی دسویں کتاب چھپوا دیں۔

عاصم کی "فردیات" ظاہری طور پر Dispersed Meditations معلوم ہوتی ہے لیکن گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسین امتزاج دکھائی دے گی۔فردیات کا ہر (فرد) ان کی جیتی جاگتی زندگی کے کسی تلخ و شیریں تجربے واحساس سے کشید نظر آتا ہے۔ہاں آپ بیتی چھپوا کر وہ بیتے سالوں کی کڑواہٹ وقساوت کو پھر تازہ کر کے رونے کراہنے کا ارادہ ہے تو اس ناسٹلجائی خود آزاری پر ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ہاں امرتا پرتیم کی طرح بیتے سال اور بیتی تلخیاں آج کے پھولوں کی کھاد بنانے کی ٹھانی ہے تو جواز بنتا ہے

ے جب بھی سنتا ہوں آواز میں ون ون ٹو ٹو کی
یاد آجاتا ہے وہ میری ماں کا آخری وقت مجھے

ے منظر وہ گھوم جاتا ہے آنکھوں کے سامنے
ماں کی کی "برسی" آتی ہے جوں جوں قریب تر

ے اکبری مزاجوں سے پالا رہا مدام
اصغری مزا ج کی خواہش ہی بس رہی

ے سنتا ہوں میں جب آواز گلی میں قلفی والے کی
سامنے میری آنکھوں کے میرا بچپن آجاتا ہے

ے چھین لیا تو نے ہم سے دریائے سندھ کا پا نی
نور سرور آنکھوں کا بھائی الفت جانی

عاصم کے تجربات واحساسات بظاہر ہمیں دیکھے بھالے سنے سنائے معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ عام سے واقعے تجربے سے بالکل ایک نیا مفہوم وابستہ کر کے قاری کو چونکا دیتے ہیں

ے کیسا دور آیا ہے عاصم دہشت کا
اب کے ہے محفوظ نمازی کیمرے میں

ے اسی لیے شدت سے اس کا انتظار میں کرتا ہوں
عید پہ خوش اور اجلے اجلے چہرے سامنے آتے ہیں

ے اردو میں مہر تک نہیں عاصم جہاں قبول
اس ملک میں رواج یہ پائے گی کس طرح!

ے اس فرش سے بیری کے نکلنے سے عیاں ہے
تخلیق کو روکو نہ رکی ہے نہ رکے گی

بعض فردیات میں تکلماتی انداز، تکرار لفظی، استفہامیہ لہجہ اور متضاد الفاظ کی موجودگی سے جہاں موسیقیت ترنم وغنائیت ابدی ہے وہیں ان چیزوں سے قاری کی توجہ مبذول کرنے کی شعوری کوشش بھی نظر آتی ہے جو کام طویل ترجیع بند نظموں کے اندر نظم نگار اندرونی قوافی سے چلا تا ہے وہی کام عاصم نے alliteration سے لیا ہے۔

ے حوصلہ افزائی نہیں عاصم حوصلہ شکنی ممکن ہے
راہ نما وراہ نمائی کا فقدان بڑا ہے ہاں

ے کم کسی نے شعر کی اصلاح کی
ہر کسی نے سن کے رسمی واہ کی

ے ملے تو ملے سکوں بتا کہاں اس کو
وہ ایک شخص جو گھر میں سکوں کو ترسے

ے کسی بھی شخص کو پڑھنے میں عاصم وقت لگتا ہے
کسی بھی شخص کا اکثر بظاہر اور ہوتا ہے

''ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست'' بجا لیکن وطن و علاقے سے محبت فطری و جبلی چیز لگتی ہے ورنہ سرکار دو عالم ہجرت مدینہ کے وقت یہ نا فرماتے کہ مکہ تو مجھے دنیا کی ہر چیز سے عزیز ہے مگر تیرے باشندے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔

ے جب وطن از سنبل و ریحاں خوش تر

کے مصداق عاصم کو اپنے علاقے، اپنی رہتل بود باش و سیب الغرض ہر چیز سے عشق ہے اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس علاقے نے اپنا مزاجِ نہیں بدلہ۔ احترام عورت، شرم و حیا، پاس رفاقت جیسی خصوصیات سے متصف اس علاقے کا نام لیتے ہی

ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔

؎ تری آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اس کا نام لینے سے
تجھے اپنے علاقے سے بڑی عاصم محبت ہے

؎ یاد آتی ہے بو کا ئن اور شہتوتوں کی چھاؤں
شہر کے A C کمروں میں بھی بھول نہ پاؤں گاؤں

اقبال کے فرمان ''قومیں شعراء کے قلوب میں جنم لیتی ہیں'' کو سامنے رکھتے ہوئے وہ منصب شاعری کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں اس لیے عہد حاضر کی چالاکیوں سے نپٹنے کے لیے وہ گوش نصیحت نیوش کو ناصحانہ انداز میں درس بھی دیتے نظر آتے ہیں۔

؎ یہ بات فون کرتے ہوئے ذہن میں رہے
اوپن سپیکر وں کا یہاں پر رواج ہے

؎ کچھ فکر اس کے اے تجھے انسان چاہیے
ہر اک سفر کے واسطے سامان چاہیے

؎ حادثوں کو بھی ذہن رکھنا
حادثے زندگی کا حصہ ہیں

Hypergraphia(خبطِ تحریر)

بادشاہ اکبر نے Gutenberg's کے پرنٹنگ پریس پر اپنے خطاطوں، خلیل اللہ اور محمد حسین کی برتری تسلیم کر کے جو پاپ کیا دین الہی پہ تو اسے اللہ جانے مگر اس خطائے اجتہادی پر ہم اسے چاہ کے بھی معاف نہیں کر سکتے کہ یہ وہی خطائے جمالی کی سزائے جلالی ہی تو ہے کہ 500 سال بعد بھی مرد مسلم بر بنائے ضد مسلم کیلی گرافی کے نام پر ملک کی کسی در و دیوار کو خالی نہیں چھوڑا گویا پورا ملک تو خوش نویسی کے نام پر قومیا لیا گیا ہو۔

جسم پر نامِ محبوب کی گدوائی۔نہر خشک ہونے پر اس کے فرش پر لکھائی۔کبھی کتابوں میں پھول رکھنا کبھی درختوں پہ نام لکھنا۔گاڑیوں کے پائدانوں شیشوں دروازوں وہ کون سی جگہ ہے جہاں پر اس خبط تحریر کا اظہار یہ نہیں ملتا۔یہ قوم تو چاند پر لینڈ کرنے کے فوراً بعد Signature کرے اور اقبال کا مصرعہ لکھے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔پطرس اس کا رونا ''لاہور کا جغرافیہ'' میں روتا ہے تو مستنصر حسین تاڑر غار حرا میں ایک رات میں ماتم کناں ہے کہ غار حرا میں بھی پاکستانیوں نے ہوم ایڈریس لکھ رکھے ہیں یعنی جہاں بھی یہ قوم جائے داستان چھوڑ آتی ہے۔

پچھلے دنوں محکمہ آثار قدیمہ کی ایک ٹیم ماڑی انڈس سکندر اعظم کے نقش پا ڈھونڈنے جا رہی تھی کہ حیرت کے یہ متلاشی مزید ورطہ حیرت ہوئے جب انہوں نے واٹر سپلائی کی چھاتی پر سنہری حروف میں یہ لکھا پڑھا ''بھٹھی (مصنف کا آبائی شہر)

انسانوں کی بستی ہے'' شاید ایسی ہی کسی نمائش فن کے بارے میں ضمیر جعفری نے اپنی نظم ''تجریدی آرٹ'' میں لکھا ہے خواب ہے دیوانے کا۔

بسیار نویسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

واش روم سنگرز سنے تھے یہ قوم واش روم رائیٹرز بھی بن گئی۔ ویسے بھی منٹو کی استثنائی مثال کے علاوہ اکثر بسیار نویس فضول نویس ہی ہوتے ہیں۔ اس غسل خانی بسیار نویسی کے دفتر اعمال میں سے ایک مثال با کمال پر اکتفا کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کچھ متلاشیانِ عشق واش رومز میں اپنے موبائل نمبرات تک لکھ جاتے ہیں۔ اور کچھ جوئینگانِ حسن انہی نمبرات کے وسیلہ سے بامِ محبوب تک پہنچنے پر کمر بستہ ہو کر اپنی کمر توڑوا بیٹھتے ہیں۔

ایک میرے سے پینڈو و بندہ نے لکھے ہوئے نمبر کے ساتھ صنفِ نازک کا مبہم سا نام پڑھتے ہی عقدِ ثانی کی تصوراتی دنیا بسانے کی ٹھان لی۔ پر یہ اڑان، بیمان انٹرنیشنل کے ذریعے Orgasm، ایزی لوڈوں منکوحہ موجودہ سے حالاتِ کشیدہ anxiety، Frustration اور ڈپریشن کے استھان پر منتج ہوئی۔

WWF کے وہ نمائندے جو ''بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا'' محاورے پر نوم چوسکی سے الجھ پڑیں کہ اس طرح کے محاورات سے شہ پا کر انسان صیاد بے زبان جانور پر یہ ظلم کریں کہ یہ خارِ گلو عملِ تنفس میں فستق ڈال کر نفسِ مطمئنہ کو واصل نرگ کر دیں۔ اور اگر وہ نمائندگان اس نظارہ کو دیکھتے جس سے میں نے بصارتِ تخلیہ کا تحلیہ کیا تو دشنام طرازی کا سلسلہ کتنا دراز ہو گیا ہوتا۔ بات یوں ہے کہ میں نے اپنی گناہ گار ہر آنکھوں سے داؤد خیل کچہ میں دو نوجوان دیکھے جس میں سے ایک زیر

حراست وہ ''میاں کوا'' تھا جس کا سر چارہ کی تلاش میں سرگرداں جالِ ظالمان میں پھنس گیا تھا اور جواب نحیف آواز میں کائیں کائیں تو کیے جا رہا تھا مگر حالتِ نزاع میں صوت نزار میں صرف حرف ''کا کا'' واضح و بین تھا۔شاید وہ لفظ کاش کا مخفف Pronounce کرنے کی سعی کر رہا تھا یا دورِ ایوب کے دو جرنیلوں کی موجودگی میں وہ ''ندیم وشکیل بلیک بیوٹی'' افتخار جالب بن کر کوئی نئی لسانی تشکیلات تشکیل دے رہا تھا۔

قصہ کوتاہ! یہ دونو جوان شکلاً مذہبی سے لگتے تھے سر پر سفید ٹوپیاں پہنے جو شاید کسی رشتہ دار کی طرف سے تبرکاً مفت ملی ہوں گی جو حج و عمرے سے واپس آیا ہوگا مونچھ برید اوپری ہونٹ، مشت بھر ڈاڑھی اور سفید لباس ناظر کی نظریں عقیدت سے جھکا دیتی تھیں ۔۔۔ پرشکل موموناں کرتوت کافراں ۔۔۔مثل کے ذہن میں آتے ہی میرے جسم میں جھرجھری سی پھیل گئی کہ ایک گروہِ مسلم شاید صنعتِ اشتقاق کی وجہ سے زاغ کو قاز سمجھ کر تناول بھی فرماتا ہے مگر یہ جان کر میری جان میں جان آئی کے کہ انہوں نے کوے میاں کی گردن میں گھنٹالی کو حمائل بنا کر جسم پر روغنِ سفید سے کچھ تحریر فرمانا شروع کر دیا۔شاید موٹروے اتھارٹی نے اسے کوئی سرکاری نمبر آلاٹ کیا ہوگا۔

خیر اس کریہہ فعل سے مجھے تو متلی محسوس ہونے لگی کہ اس غیر نظیف عمل سے تو ''زاغِ بدقسمت'' کسی گرانڈیل توند کا حصہ بنا ہوتا تو اس کی نسل ثواب دارین سے محروم تو نہ ہوئی ہوتی۔

اچھا بعض خوش نویس اپنی گدھا گاڑی پر ''جہاز'' لکھ کر وہ تپ چڑھاتے ہیں کہ تھرما میٹر کی اندر پارہ یوں اچھلنے لگتا ہے جیسے دل عاشق آمد معشوق کے غیر حقیقی تصور پر

بلیوں اچھل اچھل کر بے چارے فرہاد سے ماشاءاللہ کلاتھ ڈپو (میانوالی کا سب سے بڑا کلاتھ ڈپو) سے لیے گئے 4 نمبر کاٹن کو کاؤ کاؤ سخت کائی کی صورت اس قدر بھگو دیتا ہے کہ ستر مرداں خود اس مرد حق شناس کو پانی پانی شرمسار کر دیتا ہے۔

ایک گدھا گاڑی پر لکھا تھا دیکھو دیکھو کون آیا۔اب یہ PEC کے امتحان میں دیتے تو اقبال کے شاہین جملہ تکمیلہ کے طور پر شیر آیا شیر آیا لکھ کر 2 نمبرات ہی چٹکا لیتے۔مگر کیا کریں ٹائیگر کا دور ہے قوم ترقی جو زیادہ کر گئی ہے۔ویسے گدھوں کو چنداں پریشانی کی ضرورت نہیں کہ جیو پر Donky King کے بھی بڑے چرچے ہیں آجکل۔

ہالی وڈ کی سائنس فکشنز کے ٹریلر کی بھونڈی نقالی کا اندزہ متعالی ملاحظہ ہو کہ میری قوم ہر نو آمدہ خیالِ خام کا تناسخ بصورت نسخ و نستعلیق ٹریلروں کے چہروں مہروں پر ہی کرتی ہے کہ چلتے پھرتے یہ اشتہار خیال رسوائی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خوشبوئے پروین کی طرح کو بہ کو پھیل ہی جاتے ہیں۔خواہ یہ عمل کیسا ہی تضیع اوقات کا باعث نہ بنتا ہو۔تعرجِ خیال کے سان پر ہر چیز قربان۔اس دانش مشرق کے انداز ملاحظہ فرمائیں تاکہ میرے ''خبطِ تحریر'' سے بھی آپ کی جان چھوٹے۔

* کبھی آؤ نہ مردان خوشبو لگا کر
* بڑا ہو کے Corolla بنوں گا (چنگ چی)
* فاصلہ رکھیں ورنہ پیار ہو جائے گا
* پاس کر یا برداشت کر
* No Girl friend NO Tension

* تلاش گمشدہ ـــ I Miss My Miss

ایک ڈمپر پر تو حد ہی تھی ۔Status کو چھوڑو، صاحب بچوں کی شادی میں تھوڑا جلدی کیا کرو کون کالج سے آ رہا ہے اور کون ڈیٹ سے جو ڈرائیور ہیں وہ سب جانتے ہیں۔

یہ ہفت زبانی ہشت پہلو نورنگی اقبال و فراز سے منسوب اشعار ان پر بصورت اعمال بطریقِ کرو بیاں پیش کیے جائیں تو ان کی ارواح عالم بالا سے دوبارہ ان کی جسموں میں حلول کر لیں تو ان پر عذاب قبر کی سختیوں کا گیان کھلے اور ان کے بچے کھچے تخیل کو اشنانِ آ گاہی نصیب ہو۔

میرے مذہب میں شراب پینا حرام ہے اقبال
اس لیے تیری جدائی میں لسی پی رہا ہوں
وہ ہمیں بے وفا کہتے ہیں تو کہتے رہیں فراز
امی کہتی ہے جو کہتا ہے وہ خود ہوتا ہے
میں طالب ہوں تیرے پیار کا فراز
مجھے طالبان بننے پر مجبور نہ کر

کچھ عورت کے بارے میں ۔۔۔

* انڈین سوپ دولوگ دیکھ سکتے ہیں ایک اپاہج اور دوسرا عورتیں۔

* عورتیں ایک کام شاپنگ سے بھی زیادہ کرتی ہیں وہ ہے ونڈو شاپنگ

* عورت ہر چیز سنبھال سکتی ہے سوائے راز کے

* عورت نہ بولنے سے پہلے سوچتی ہے نہ بولنے کے درمیان اور نہ بولنے کے بعد۔ اس گناہ کبیرہ سے بچنے کے لیے اس نے پکا پکا احرام باندھا ہوا ہے۔

* عورت خواہ کتنی ہی ان پڑھ و گنوار کیوں نہ ہو علم حساب میں خوارزمی سے کم نہیں ہوتی۔

* سارے مرد واجد علی شاہ ہوتے ہیں یہ کہنا زیادتی ہوگی اور ساری عورتیں مونا لیزا ہوتی ہیں یہ کہنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔۔۔۔۔۔

* مرد گھر بچانے کے لیے عورت کا کہنا مانتا ہے اور عورت گھر توڑنے کے لیے مرد کا کہنا نہیں مانتی نیوٹن کے مطابق عمل اور ردعمل برابر ہوتے ہیں سو گھر تو رہتا ہے مگر آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مطابق ایک چیز کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہے بے سکونی۔۔۔

* کراماً کاتبیں کے مطابق مرد کے نامہ اعمال میں سب سے بڑا گناہ اس کا اپنی بیوی کو بے خیالی میں "I Love You" کہنا ہے۔

* بلاول کی پریس کانفرس والا پانی اور تارڑ صاحب کے (بہاؤ) والا پانی دونوں مل کر

بھی عورت کے غصے کو ٹھنڈا نہیں کر سکتے۔۔۔۔

* وہ بے وقوف ڈیٹ پر جائے جس کی آخری ڈیٹس چل رہی ہوں کیوں کہ ڈیٹ کے بعد اکثر شادی ہی کی نوبت آتی ہے۔۔۔کہ آسکر وائلڈ نے ویسے ہی کہہ رکھا ہے۔

Acceptanc of proposal is death of romance

* تعلیم نہ افغانیوں کا کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ زنانیوں کا۔۔۔۔

ہند کے شاعر و صورت گروہ افسانہ نویس

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ ہے عورت سوار

* اقبال نے جب یہ شعر کہا تھا اس وقت خود ان کے اعصاب پر 5 عورتیں سوار تھیں 3 ان کی بیویاں اور باقی دو علم کی تاثیر سے زن سے نازن ہو چکی تھیں۔۔۔(میری مراد میگ ٹیکرٹ + عطیہ بیگم)

* عورت ناممکن سے ناممکن کام کر سکتی ہے سوائے چپ رہنے کے۔۔۔۔یہ کام اس کی شانِ گویائی کے خلاف ہے۔۔۔۔۔

* عورت کتنی ہی بے وقوف کیوں نہ ہو تنخواہ کے مصارف مرد کو دو منٹ میں بتا سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔

* مردوں میں اقبال کے شاہین کے خواص کا تو مجھے علم نہیں، عورت میں ایک وصف ضرور ملتا ہے۔۔۔کل کے لیے کچھ نہیں چھوڑتی۔۔۔۔۔۔

* فیمنیزم تحریک کے بیش بہا ثمرات کے بعد 21 صدی کے اکثر مرد اگلے جنم میں عورت بننا چاہیں گے۔۔۔۔۔۔۔

* عورتیں جتنا میک اپ کر کے بازاروں میں جاتی ہیں اس سے نصف کر کے گھر

رہیں تو ان کے شوہر انڈین فلمیں دیکھنا چھوڑ دیں۔۔۔۔۔۔۔

* تازہ رپورٹس کے مطابق عورتیں سب سے کم مدنی چینل دیکھتی ہیں اور ٹھیک بھی کرتی ہیں کہ اس چینل پر عورت نام کی ہی نہیں اور مرد آنکھوں کا قفل مدینہ لگائے تشریف فرما ہوتے ہیں۔

* عورت سردیوں میں سائبیریا اور گرمیوں میں جیک آباد بن جاتی ہے مرد بے چارہ اسے معتدل کرتے کرتے خود راہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے۔۔۔

* مرد اتنی توجہ جمعہ کے خطبہ کو نہیں دیتے جتنی انہماک سے عورتیں آپا زبیدہ کے ٹوٹکے سن رہی ہوتی ہیں۔۔۔

* عورتیں طبعاً صفائی پسند نہیں ہوتی میں نہیں مانتا۔۔۔جس چترائی سے وہ یکم پہ مرد کی جیب صاف کرتی ہیں اس پہ تو کہنہ مشق جیب تراشوں کو بھی رشک آتا ہوگا۔۔۔

* عورت کی عقل ٹخنوں میں ہوتی ہے یہ اس پہ الزام ہے وہ بے چاری تو اس نعمت غیر مترقبہ سے سرے سے محروم ہے۔۔۔۔

* عورت خوش گلو تان سین ہی کیوں نہ ہو یکم پہ پیسوں کا تقاضہ بے سرے پاپ سنگر کی طرح ہی کرتی ہے۔

* گھر میں سکون دو باتوں سے آسکتا ہے یا عورت گونگی یا مرد بہرا۔

* مرد کو عزت یا طالبان کے دور حکومت میں ملی یا پھر کنوارے پن میں۔

* مرد بھلے تاج محل بنائے یا کنگ ایڈورڈ کالج عورت زیادہ سے زیادہ مرد کے لیے مغفرت کی دعا ہی کر سکتی ہے۔۔۔

ارسطو کی غیر اخلاقی اخلاقیات

رسل نے تو خیر ابتداء میں ہی کہ دیا تھا کہ (Aristotle's Ethics) کسی ادھیڑ عمر کے معزز شخص کو تو متاثر کر سکتی ہے جو اس سے نوجوانوں کے اشتیاق و جوش کو دبائے رکھنے کا کام لینا چاہتا ہو لیکن جس شخص میں کسی بھی جذبے کی گہرائی ہو اس کے لئے یہ باعث نفرت ہی رہے گی۔

لیکن میں چوں کے ازلی کٹر افلاطونی مثالیت پسند واقع ہوا ہوں لہذا میری بدنصیبی کہ جب تک مجھے تھامس مور کے خلائی یوٹوپیا سے گزر کر جوناتھین سوفٹ کے ٹریولز کی سفاک حقیقت پسندی سے آشنا کر کردے۔ Aesop's Fable اور آسکر وائلڈ کی جمالی فقرہ بازیوں کی رنگینی کے سحر سے آزادی میرا مقدر نہیں بنتی۔

Nicomacahean کی ابتداء تو خیر مسرت خیز ہی رہی کہ ارسطو نے مسرت کو خیر جو قرار دیا۔ مگر یہ فسوں کاری اس وقت زائل ہو گئی جب ارسطو جبراً نیکی سرزد کرانے کا باشن دینے لگے اور فرمانے لگے جب ہمیں اچھی عادتیں اپنانے پر مجبور کیا جاتا ہے تو کچھ وقت کے بعد اچھے اعمال کر کے ہمیں خوشی محسوس ہونے لگتی ہے یعنی رواج کے اس دیو کے ہاتھوں جذبات کی خودکشی کر ڈالو تا کہ طمانیت کا گیان ملے۔

لگتا ہے ارسطو کو Golden Mean اور تناسب کی Addiction رہی ہے وہ سچائی کو شیخی اور مصنوعی انکسار میں اعتدال ٹھہراتے ہیں تو انصاف کو مساوات کے برعکس تناسب گردانتے ہوئے اشرافیہ کو مستثنٰی قرار دیتے ہیں بالکل ایسے

ہی Ruling Lot نے پاکستان میں آئین کی بالادستی اور ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے قومی مصلحت کے نام پر پوری قوم ذبح کر ڈالی۔ وہ تو آقا و غلام کو ایک درجے کے شہری تسلیم کرنے سے انکاری ہیں مساوات و انصاف چہ معنی!

سونے پہ سہاگہ وہ کم تر کو برتر سے زیادہ محبت کا بھاشن بھی دیتے نہیں تھکتے۔ پھر جب وہ باپ کو بیٹے کو تیاگنے کا اذن کلی بھی عنایت فرما دیتے ہیں تو مجھے پاکستانی والدین یاد آجاتے ہیں جو آئے دن اخباروں میں بیٹوں کو عاق کرنے کے اشتہارات چھپواتے ہیں۔ بیٹیوں کو تو خیر تہہ خاک سلا دیتے ہیں۔

جنسی تفاوت کی اولین تخم ریزی کرتے ہوئے ارسطو مرد کی عورت پر برتری ثابت کرتے ہیں چناں چہ فرماتے ہیں کہ جس طرح آقا کا غلام پر انسانوں کا نباتات و حیوانات پر افضل ہونا ثابت ہے اسی natural hierarchy کے تحت مرد عورت پر حاکم ٹھہرا۔ تقدیر کا یہ قاضی عورت کی باکرانہ آزادی اٹھارہ سال کی عمر میں سلب کر دیتا ہے تو patriarchal سوسائٹی کا یہ Monarch مردوں کو سینتیس سال تک French leave بخش دیتا ہے۔ شاید اسی لئے Feminists سے پھر misogynist کا خطاب بھی حاصل کرتا ہے۔

ارسطو کا ''فیاض انسان'' فضائل و کمالات سے مزین ایک مثالی کردار ہے جس کی گونج کئی صدیوں بعد ابن العربی کے مرد کامل نطشے کے سپر مین اور اقبال کے مردِ مومن میں واضح سنائی دیتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایسی خوبیوں سے مسجع شخصیت کی توقع وہ صرف اشرافیہ یا شہنشاہوں سے ہی رکھتا ہے کہ تمام شہری بقول ارسطو اس طرز زیست کو اپنائیں گے تو لوگ تمسخر اڑائیں گے۔ والعیاذ باللہ

ویسے والعیاذ باللہ تو میں نے روایتاً کہہ دیا کہ ڈالا کہ ارسطو تو اخلاقیات کو سیاسیات کی ہی ایک شاخ قرار دے کر ethics کو بھی طبقہ اولیٰ کی commadity سمجھتے ہیں۔یعنی اخلاقیات کو سیاسیات کے تابع فرمان کر کے ان کا مدعا یہی ہے عوامی اکثریت اس چیز دگر سے دور ہی رہے تو بھلا!

دوستی کے حوالے سے جو کچھ معلم اول کے قلم سے نکلا ہے رسل کے بقول اس میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں جو فہم عامہ سے بلند تر ہو مگر اس فراست عامہ پر ایک اعتراض تو بہرحال ضرور بنتا ہے کہ دوستی بر بری کی بنا پر ہو سکتی ہے لہذا خدا سے دوستی ناممکن ہے کہ خدا ہم سے محبت نہیں کر سکتا۔مخلوق و خالق کے فرق کو واضح کرنے کے لئے کیا دور کی کوڑی لائے ہیں یہ انہی کا اعجاز خامہ ہے۔

ہر سال یکم مئی دنیا بھر کے مزدوروں پر بالعموم اور شکاگو سانحہ کے ان مزدوروں کی ارواح پر بالخصوص ارسطو کا یہ جملہ عذاب الیم بن کر گرتا ہوگا کہ:

''مزدور پیشہ نیکی و پارسائی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔''

ارسطو زاہد خشک کی طرح مے انگین و محفل رقص و سرور سے تو کوسوں دور رہنے کا وعظ کرتے ہیں حتیٰ کہ فحش کلامی سے بھی پرہیز لازم ٹھہراتے ہیں مگر حیران کن طور پر مندروں و عبادت گاہوں میں ان مغلظات کی اجازت مرحمت فرما دیتے ہیں۔

قوت پرست ارسطو کو فاتح ہر حال میں معصوم عن الخطاء اور حق بجانب ہی نظر آتا ہے۔ Might is right کا یہی اصول بعد میں تمام یورپی ریاستوں کی استعماری سامراجی خارجہ پالیسی کا Guiding Principle بنا رہا۔

تجارت مخالف ارسطو سود خوری کی شدید مزمت کرتا ہے تو دل باغ باغ

ہو جاتا ہے لیکن اس خوش گمانی پر اس وقت چوٹ لگتی ہے جب اس سوچ کی اصل محرک اس کی اس دور کے دیندار طبقہ سے اس کی وابستگی آشکار ہوتی ہے۔ارسطو کے نزدیک جرائم تفریط زر کے بجائے افراط زر کے باعث ہوتے ہیں میں حیران ہوں پھر افریقی جنوبی ایشیائی تیسری دنیا کے ان غریب مفلوک الحال عوام نے ڈاکہ، چوری، چھینا جھپٹی کا بازار کس کا ربپا کر رکھا ہے۔

استبدادی ریاست کے حوالے سے ایک مستعبد کو جو ناصحانہ پھول ارسطو نے ارشاد فرمائے انہی افکار عالیہ سے متاثر ہو کر میاولی و بیکن جیسے خودغرض مفکرین نے ایسی ایسی تحریرات تصنیف فرمائیں کہ امریکہ و برطانیہ جیسی استعماری ریاستوں نے پھر پورے نظام ہائے فتنہ کار تشکیل دے کر پچھلے پانچ سو سال سے غریب اقوام کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ مستعبد کو نصیحتی پھول عنایت کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں کہ وہ لوگوں کو بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں مصروف رکھے جیسے مصر کے بادشاہوں نے اہرام مصر بنوائے۔انہیں یہ خبر نہ تھی کہ یہ اہرام آدم کی تخلیق سے بھی قبل جنوں نے اپنی زمینی قیام کے دوران تعمیر کیے تھے۔

نسل پرستانہ سوچ کے حامل ان جملوں پر غور فرمائیے۔

''صرف یونانی ہی بہادر و ذہین ہوتے ہیں اگر یہ ایک ہی روش اختیار کریں تو دنیا پر چھا جائیں''۔

یہ بات یقین سے تو نہیں کی جاسکتی کہ اس کے شاگرد رشید نے استاد محترم کے ان ترغیبی جملوں سے شہہ پا کر دنیا کو کھنڈر بنا ڈالا تھا البتہ ماضی قریب میں ہٹلر و

مسیو لینی وسٹالن نے اسی سوچ کو وحی والہام سمجھے رکھا اور حال ہی میں مودی کی RSS اسی نظریے پر کمر کس چکی ہے۔

گفتگو کا خاتمہ کرتے ہوئے میں یہاں عرض کروں گا کہ مغرب نے ارسطو کے کن کن ارشادات کو عملی جامہ پہنایا اس پر تو کچھ گزارشات آپ کے سامنے پیش کر دیں اب یہاں ذکر اپنی پیاری قوم کا۔

معلم اول کی مرجانی پوٹلی سے دو ہیرے میری قوم نے بھی چنے۔ جی ہاں

پہلا:

کبھی اس ملک میں جمہوریت کے شجر ممنوعہ کی آبیاری نہیں کرنی

اور دوسرا:

اپنی نسل کے نوجوانوں کو کبھی ایسی تعلیم نہیں دینی کبھی ایسا فن نہیں سکھانا کہ وہ روپیہ کمانے کے قابل ہو جائیں۔ کیونکہ ارسطو کے بقول "تعلیم کا مقصد فضیلت ہے افادیت نہیں۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

اللہ عزوجل نے قرآن پاک میں پیغمبر اسلام کے خصائص بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

یَتلوا علیھم ایتہٖ وَ یز کیھم وَیعلمھم الکتب و الحکمۃ

''یہ پیغمبران پر میری آیتیں تلاوت فرماتے ہیں ان کا تزکیہ(ظاہری و باطنی) کرتے ہیں اوران کو کتاب وحکمت سکھاتے ہیں''

گویا بطور پیغمبر سرکار دو عالم کی ذمہ داری کتاب وحکمت کی تعلیم کے ساتھ تزکیہ نفس بھی تھا اوراسی تزکیہ کے بارے میں ایک اورجگہ قرآن پاک میں ارشادہوا۔

قد افلح من تزکی (الاعلی ۳۰۔۱۴)

''جس نے تزکیہ نفس کیا اسی نے فلاح پالی''

پاک پیغمبر نے اپنی کئی حیثیتوں ، جہتوں اورمناصب کے ہوتے ہوئے اپنی بطورِ معلم اورمکارم اخلاق والی حیثیت پرفخرمحسوس کیا اورارشادفرمایا:۔

۱) انما بعثت معلما

۲) انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

جہاں ان ارشادات سے استاد کے منصب ومقام کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ وہیں استاد کے جملہ فرائض کا تعین بھی ہوتا ہے۔استاد کی ذمہ داری نہ صرف تعلیم کے عمل کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے بلکہ طلباء کو باکردار، بااخلاق اورمعاشرے کے مفید شہری بنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔تعلیم کی اسی اہمیت کے پیش نظر مولا علیؑ نے ارشادفرمایا۔

''جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا میرا آقا ہے۔ چاہیے تو مجھ سے خدمت لے چاہیے تو مجھے بیچ دے''

صفہ کی درس گاہ ہو مسجد نبوی ﷺ کا صحن ہو دارارقم ہو یا بدر کے قیدی پیغمبر اسلام نے ہمیشہ علم کی اشاعت و ترویج کو اولیت دی۔ مجالسِ علم کو جنت کی پھلواڑیاں کہنا، حصّولِ علم کو فرضِ عین قرار دیا، طالب علم کی راہ میں فرشتوں کے پروں کا بچھایا جانا، تحصیلِ علم کے لیے چین تک کا سفر، راہِ علم میں موت کو شہادت ٹھہرانا، محفل ذکر اور محفل علم دونوں کو خیر فرما کر پھر محفل علم میں شرکت یہ سب جہاں علم کی ضرورت و اہمیت پر دال ہیں وہیں اس تعلیمی عمل کو ممکن بنانے والے معلم کے اعتلاء وعلّو کا بین ثبوت ہیں۔

استاد کے اسی مقام و منصب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی نے کیا پیاری بات کہی ہے۔

"Teaching is the profession that teaches all other professions and without teachers life would have no class."

میں نے کہیں پڑھا تھا Some are born great.

اسی مقولہ کی عملی تصویر اگر کسی نے دیکھنی ہو تو وہ عطا محمد شاہ کی بےنظیر شخصیت کا نظارہ کرے۔ شخصیت کے ساتھ بےنظیر کا سابقہ بطور اسم صفت لگا دیکھ کر حیرت زدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ شخصیات آپ نے بےشمار دیکھی ہوں گی، سنی ہوں گی، پڑھی ہوں گی، جو اپنے تئیں، اپنے دائرہ کار، متعلقہ ڈسپلن، اپنے دائرہ عمل یا اپنے مضمون میں تخصص و مہارت رکھتی ہوں گی لیکن ایسی شخصیات جو اخلاقی، سماجی،

انتظامی، تعلیمی غرض ہر شعبہ ہائے زندگی میں جوہرِ کامل، یکتائے زمانہ، نابغہ روزگار اور حسنِ انمول ہو اسے بے نظیر کے علاوہ بھلا کس Adjective سے پکارا جائے؟ Philonthropist Reformer, Humanitarian, Motivational Leader,Trend Setter وغیرہ جیسی جتنی ماڈرن اصطلاحات جو مختلف لوگوں کی صفات کی Description کے لیے وضع کی گئی ہیں ان سب کو ملا کر اگر ایک لفظ تشکیل دیا جائے جو عطا صاحب کی شخصیت کو کماحقہٗ Define کرتا ہو تو وہ "MATCHLESS" ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ نے اچھے نام رکھنے کا حکم دیا ہے کیوں کہ نام بچے کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے سامنے جب دور جاہلیت کا کوئی نام آتا تو آپ ﷺ اس کو اچھے نام سے بدل دیتے۔ ابوبکر صدیقؓ کے اسلام سے قبل کے نام عبد الکعبہ کو عبداللہ بنا دیا۔ عاصیہ نامی خاتون کا نام بدل دیا گیا کہ جب نام کا مطلب ہی گناہ گار ہو تو نیکیاں کیسے ہوتی ہیں۔ عطا محمد شاہ صاحب کے نام میں شامل اسم محمد نے بھی عطا صاحب پہ اپنی عطاؤں کی بارش کی ہوگی۔

انہی کے نام سے پائی فقیروں نے شہنشاہی
خدا سے بھی ملاتا ہے محمدؐ نام ایسا ہے

عطا صاحب کے نام میں لفظ ''شاہ'' زمانے پر ان کی سرداری و نیابت کی علامت ہے اور میرے نزدیک عزت واحترام میں زمانے پر سرداری نوبل پرائز، بکر پرائز اور آسکر ایوارڈ سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ جتنی عزت میانوالی میں عطا صاحب کے حصے میں آئی اس کا عشر عشیر بھی جملہ گدی نشینوں، سیاست دانوں اور دیگر ممتاز عہدوں

پر براجمان ہستیوں کے حصے میں نہیں آیا۔

نو رنگا جو No رنگا تھا اس کونو (۹) رنگوں سے سجانے والی ہستی کا نام عطا محمد شاہ ہے۔قوس قزح میں 7 رنگ ہوتے ہیں۔ Primary بھی Secondary بھی عطا صاحب نے اس علاقے کو دو (۲) Tertiary رنگوں میں سے بھی مزین کر دیا یہ دو رنگ عقیدت اور محبت کے ہیں۔اب جہاں بھی لفظ نو رنگا گو بختا ہے تو سماعتوں میں نو (۹) رس گھل جاتے ہیں۔سوچ کے گلاب مہکنے لگتے ہیں دل کے کنول کھل اٹھتے ہیں۔اور آنکھوں میں امید کے سورج ضیاء پاشیاں کرنے لگتے ہیں نو رنگا سے عطا صاحب ایسے منسوب ہو گئے ہیں جیسے ایتھنز سے ارسطو،لندن سے شیکسپئر، ایڈن برگ سے رابرٹ برنز، پاک پتن سے غلام فرید اور قصور سے بابا بلھے شاہ۔

حبِ جاہ سے کوسوں دور حبِ جہاں کے جذبے سے سرشار رزقِ نصیب پر نفسِ مطمئنہ کی تصویر جس کی تعلیم و تربیت کا طلباء کو اتنا حیا ہوتا کہ بقول پرنسپل عابد حسین گورنمنٹ سیکنڈری سکول موچھ:

''ہم گھر میں بھی کوئی غلط کام کر رہے ہوتے تو عطا صاحب کا خیال آتے ہی ہمارے ہاتھ کو کوئی غیبی طاقت روک لیتی خوف سے ہمارا رواں رواں کھڑا ہو جاتا مبادا کھڑا عطا صاحب کو پتہ چلا تو خفا ہو جائیں گے"

صفہ کی طرز پر ایک اقامتی ادارے کا وجود اور وہ بھی ایسے پسماندہ مقام پر جہاں تعاون کا فقدان،سہولتوں کی کمی،ذرائع کی کم یابی اور دور افتادگی سے کامیابی کے امکانات ناپید ہو جاتے ہیں۔بقول شاعر

نور سے دور سیہ رات میں زندہ رہنا
کتنا مشکل ہے مضافات میں زندہ رہنا

ایسے نامساعد حالات میں کشف و کرامات دکھانا سادات کی ہی روایت رہی ہے۔نور زنگا سکول ایک ایسے مقام پر تھا جہاں دریا میں سیلاب کی آمد کے ساتھ سکول کی shifting یعنی ہجرت کا سفر بھی شروع ہو جاتا اور نور زنگا کا پورا سکول (اور سکول تھا ہی کیا؟ ایک عدد کرسی، تختہ سیاہ، چند ٹاٹ اور----ولولہ) شیخاں والا بڈھے خیلاں والا اور بعض اوقات خان محمد والا تک ہجرت کر کے منتقل ہو جاتا چشمِ تصور سے دیکھیے آج کی جدید دنیا میں Brain Drain کا عمل حکومتوں کو کتنا اذیت ناک لگتا ہے اور یہی Brain Drain ہر سال بلکہ سال میں کئی بار ہوتی مگر علاقے کے طلباء و والدین کی آنکھیں رشک و تفاخر کے جذبات سے بھیگ رہی ہوتیں اور ہر قطرہ زمین پر گرتے ہی گوہر قبولیت سے شرف یاب ہو کر علاقے کے ازلی بنجر پن کو زرخیزی میں بدل رہا ہوتا حدیث کے مصداق فرشتے علم کی راہ پر چلنے والوں کے رستے میں شہ پر رحمت بچھا رہے ہوتے اس وقت ان متلاشیانِ علم کے معلم اعلیٰ کی قدم بوسی کے لیے کر و بیاں میں ''انا اوّل'' کی صدائیں مامون و امین کا منہ چڑا ہوتیں۔تپلی چشم فلک کی پیرانہ سالی کی ہمسری کا دعوی کریں تو کیا کریں؟ ہاں! ثقہ راویوں کے کھینچے ہوئے مناظر کی کلائیڈ وسکوپ سے جب کوئی منظر ان بدنصیب آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو اس دھرتی کے سپوت پر فخر سے آنکھوں کو طراوت ملتی ہے۔

ہمارے تعلیمی اداروں میں عام طور پر دو طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ اول بعض اوقات کثیر طلباء اساتذہ کے خوف سے جوان کے چہرے پر (معذرت

کے ساتھ) ہر وقت بارہ بجے ہونے کی وجہ سے طاری رہتا ہے۔۔۔۔کی وجہ سے یا تو وہ سکول چھوڑ جاتے ہیں یا کلاس میں Tense ماحول میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے سے تعلیم کے عمل کو تکلم بنا دیتے ہیں یعنی

کچھ وہ کھچے کھچے رہے کچھ ہم تنے تنے
اسی کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

دوسری طرف بعض اوقات استاد کی (Too much leniency) یا مضمون پر گرفت نہ رکھنے کی وجہ سے طلباء استاد کو تضحیک کا نشانہ بنانے کے لیے غیر متعلقہ سوال کا انبار لگا کر استاد محترم کے تدریسی عمل کو ناکارہ بنا دیتے ہیں۔اس طرح کی دونوں صورتحال کا سامنا اس وقت ہوتا ہے۔جب استاد اور طالب علم دونوں کی طرف سے دو چیزوں کا فقدان ہوتا ہے Respect اور Acceptence۔ایسے اساتذہ جو طلباء کو Grade کی وجہ سے دونوں چیزیں دیں وہ کمزور طلباء کے سب سے ناپسندیدہ ٹیچر ہوتے ہیں اور ایسے اساتذہ جو مضامین پر گرفت نہ رکھنے کی وجہ سے طلباء سے دوستانہ رویہ اپنائیں وہ laughing stock بن جاتے ہیں۔عطا صاحب کو نہ صرف مضمون پر گرفت تھی بلکہ خدا نے ان کو پر وقار Personality سے نوازا تھا ان کے چہرے پر وقار متانت کے ساتھ سدا بہار بشاشت بھی موجزن رہتی وہ لطائف و چٹکلے بھی سنایا کرتے یعنی حالی کے الفاظ میں حیوان ناطق نہ تھے۔بلکہ انسان ظریف تھے (حالی سے معذرت کے ساتھ حیوان ظریف لکھنا میرے نزدیک سوءِ ادب ہے) وہ کلاس میں معمول کی سنجیدگی لیے داخل ہوتے مگر ماتھے پر مصنوعی شکن نہ ہوتی نہ زبان میں کڑواہٹ بلکہ اسلام علیکم کی تسلیمات سے سلامتی کی پر بہار ساعتیں آغاز سے کلاس

کے اختتام تک جاری رہتیں۔

غصہ فطری جذبہ ہے کس کو نہیں آتا مگر ارسطو کے الفاظ میں

"Anyone can become angry______ that is easy but to be angry at the right person, to the right degree, at the right time for the right purpose and in the right way_______ that is not easy"

یہی مشکل کام انہوں نے کر دکھایا ایسی مشکل صورتحال سے خوش اسلوبی سے نپٹنا انہی کا خاصا تھا ایک ذرہ سی خفگی سے کلاس پر رعب وجلال چھا جاتا اور یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب طلباء استاد کو محولہ بالا دو چیزیں دیتے ہیں Respect اور Acceptence اور یہ دو چیزیں طلباء تب دیتے ہیں جب استاد کا رویہ طلباء سے Friendly مگر Dignified ہو اور استاد بچوں کو صرف پڑھاتا نہ ہو بلکہ پڑھنے والا بناتا ہو کیونکہ How to teach better کے فن میں طاق ہونے میں برسوں لگتے ہیں۔

ہر سال تین ماہ کے لیے Coaching جس میں سیکڑوں طلباء کی رہائش اور دیگر سامان خورونوش کا بندوبست کرنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے مگر سالہا سال انہوں نے یہ کام خوش اسلوبی سے کیا۔دن کے جملہ تعلیمی امور کے ساتھ ہم نصابی سرگرمیاں، سپورٹس کے مواقع مہیا کرنے کے ساتھ بچوں کو پنجگانہ نماز کی ادائیگی کی سخت ہدایت ہوتیں طلباء کے اندرونی حالات تک کے لیے درست رسائی کے لیے انہوں نے طلباء کا SPY group تشکیل دیا ہوا تھا۔جن کو لیاقت ہمدردی اور

صداقت کی بنیاد پر مقرر کیا جاتا تھا تاکہ خواہ مخواہ جھوٹی شکایات سے بچا جائے ان کا حکم قانون کا درجہ رکھتا تھا لیکن وہ طلباء کو ہر اس کام کا حکم دیتے جن پر وہ خود بھی کاربند ہوتے۔ چاسر کے الفاظ ہیں

Frist I wrought

Then I thaught

نصابی سرگرمیوں میں جہاں نورنگا سکول کا طوطی بولتا تھا وہاں تقاریر اور کھیلوں میں اس ادارے کے طلباء ید طولی رکھتے تھے۔ ضلع کی تمام پوزیشنیں اس ادارے کے پاس ہوتیں۔ عطا صاحب کو اپنی محنت اور طلباء کی صلاحیتوں پر اتنا یقین تھا کہ ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں مڈل سٹینڈرڈ کے امتحانات میں تاخیر ہوگئی عطا صاحب نے جنرل صاحب کو خط لکھ دیا کہ میرے کئی طلباء کی تین ماہ کی محنت اور لگن ضائع ہو جائے گی اور یہ غریب طلباء وظیفہ سے محروم ہو جائیں گے، جنرل ضیاء نے ان کو جوابی خط لکھا کہ ''آپ تیاری جاری رکھیں اگلے ہفتے Datesheet جاری کر دی جائے گی۔ اسی سال کثیر طلباء نے وظیفہ حاصل کیا۔

نقل کو وہ قتل عمد سمجھتے تھے۔ بڑی سے بڑی غلطی کی معافی مل سکتی تھی مگر اس شرکِ عظیم (نقل) پر طلباء کی شامت اعمال آتی۔ وہ انفرادی کوشش سے طلباء کے جوہر باطن کا سراغ لگا کر تحریک (Motivation) حوصلہ افزائی (Encouragement) اور اعتماد سازی (confidence building) کے راستوں سے ہوتے ہوئے کردار سازی (Character building) کی منزل تک بآسانی پہنچ جاتے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا ہو طلباء کو motivate کرتے کیونکہ یہی مشکل مرحلہ ہوتا ہے Horace Mann کے الفاظ میں؛

"A techer who is attempting to teach without inspiring the pupil with a desire to learn, is hammering on a cold iron"

اپنے طلباء کو Prodigy (فطین) بنانے کے لیے وہ انہیں پیشگی ایقان فطانت کا Certificate عطا کر دیتے جب ایک بار انسان کو اپنی ذات پر یقین ہو جائے وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے اسی کو ابنِ عربی اور اقبال خودی کا نام دیا ہے۔اس بات کی مزید کھوج لگانے کے لیے باب العلم کے دروازے پر دستک دیتے ہیں تو وہ فرماتے نظر آتے ہیں۔

''تم وہی کچھ ہو جو تم خود کو سمجھتے ہو''

اغلب ہے کہ Meera Ravi نے اسی فرمان کے پیشِ نظر اپنی کتاب "Teaching the Heart" میں جملے لکھے ہیں۔

No one knows you better than yourself.

No one knows what is happening to you.

No one can think for you.

No one can force you to do anything.

No one but you can help yourself.

انگریزی کا ایک مقولہ ہے۔

The best teacher teaches from the heart not from the book.

عطا صاحب بھی آموختگی کے عمل کو ہمیشگی عطا کرنے کے لیے زبان سے پڑھانے کی بجائے دل سے پڑھاتے ۔اسی لیے ان کے اسباق دل پر نقش ہو جاتے کیونکہ دماغ کی یاداشت متاثر ہوتی رہتی ہے ویسے دماغی کارگری ثابت کرنے کے لیے طلباء کوتکرار کرانے کی کاریگری میں بھی وہ دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔اور اس تکرار کا سارا فوکس رات کے وقت ہوتا تھا۔وہ ساتھ ساتھ علامہ ذرنوجی کو Quote کرتے جاتے بیٹا!رات کوخوب پڑھا کرو کیوں کی کوجس طرح اونٹ بہتر سفر کرتا ہے۔ویسے ہی انسانی دماغ ان خاموش اور پرسکون گھڑیوں میں جو ہر دکھا تا ہے۔

قدرت جب تقدیر بدلنے لگےتو موسیٰ کا صندوق فرعون کے محل تک بہالے جائے۔یوسف کو کنعان میں بیچوا کے شاہ مصر بنا ڈالے کچھ ایسا ہی اس چودہ پندرہ سالہ چرواہے کے ساتھ ہوا جو بکریا چراتے چراتے نورنگا سکول کے قریب آ گیا عطا صاحب کی نظر پڑی پھر کیا ہونا تھا ان کی نظر تو کیمیا تھی اور نظر کیمیا ہو تو:

نظر جنہاں دی کیمیا ہوندی اوتے سونا کردے وٹ

عطا صاحب نے اس کو کلاس ہشتم میں بٹھا کے اس کے ہشت پہلو روشن کر دیئے اس خاکسار کو ید بیضا سے کندن بنا ڈالا اس بچے کا نام غلام شبیر ہے اور وہ آج کل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔مضمون کی طوالت کی وجہ سے اس جیسی سیکڑوں مثالوں سے احتراز کیا جا رہا ہے۔ڈاکٹر عصمت اللہ،ڈاکٹر

حنیف ،ڈاکٹر عبدالرؤف،ڈاکٹر ساجد خان،ڈاکٹر مہر خان، پرنسپل عابد حسین خان جیسے دیگر کئی شاگرد عسکری و تعلیمی اداروں کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات ہیں اور اس طویل فہرست میں سے کوئی ایک بھی سونے کا چمچ منہ لیے پیدا نہیں ہوا مگر آج ان کا حال و مستقبل تابناک و روشن ہے۔

حیرانی ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو کلاس ہشتم میں مقدمہ شعر و شاعری اور آب حیات 'جیسی کتب گھول کر پلا دیتے تھے اور آج ہمارے ایم فل اور پی ایچ ڈی افراد بھی ان بلند پایہ کتب کے ناموں سے معمولی شناسائی رکھتے ہیں۔

علاقے کی ممتاز اور قابل احترام شخصیت ہونے کی وجہ سے اکثر تصفیوں کے فیصلے کرانے اور قبائل کی دشمنیوں کو مٹانے میں مصالحتی کردار ادا کرنے ،علاقے بھر کی خوشی غمی میں شریک ہونے اور دیگر گوناگوں مصروفیات کے ہوتے ہوئے بھی کوئی چیز ان کے اور سکول کے بیچ مانع نہ ہوتی۔زمین کے جس کونے میں ہوتے سکول حاضری جیسے ان پر فرض ہوتی۔

آج جہاں سربراہان ادارہ اساتذہ وسٹاف سے شکایات کے دفتر کھولے بیٹھے ہیں۔وہاں ان کو اپنی اداؤں پر بھی غور فرمانا چاہیے اساتذہ کی عزت نفس کا خیال رکھ کر وقت پر تشریف لا کر سکول کو اپنا گھر اور طلباء کو اپنی اولاد سمجھ کر عطائے ثانی بن جائیں تو پھر دیکھیں اساتذہ ان کے احکامات کی بجا آوری کو مجبوری نہیں سعادت سمجھیں گے۔

محبتوں کا سفیر

ممتاز مفتی نے انور سدید کو کہا تھا کہ تم بڑے لکھاری ہو اس سے بھی بڑے بن سکتے ہو اگر تمہارے سر سے وزیر آغا کا بھوت اتر جائے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے خود ممتاز مفتی کے دماغ پر قدرت اللہ شہاب ہر وقت سوار رہتے تھے پچھلے چند برسوں سے میرے دماغ پر بھی عاصم بخاری کا جن سوار ہے۔

عاصم بخاری پر لکھتے ہوئے مجھے بالکل ویسی ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جیسے اشفاق احمد کو ممتاز مفتی پر لکھتے وقت پڑتا تھا کیونکہ ادب کے ناقدوں نے ہر صنفِ ادب کے بارے میں کچھ ایسی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں کہ آپ اس لیگل فریم ورک سے باہر نہیں جاسکتے مثلاً خاکہ نگار کے لیے یہ پابندی عائد ہے کہ خاکہ لکھتے وقت خاکہ نگار اپنی خاکوانی کی مکمل مدح سرائی نہیں کرسکتا اور اس کو ایک اچھے، اعلی اور معیاری شخص کے طور پر پیش نہیں کرسکتا۔ اس کو خاکوانی کی شخصیت میں تھوڑی بہت برائی ضرور شامل کرنی پڑے گی خواہ وہ مانگے کی برائی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری پابندی خاکہ نویس پر یہ لگائی گئی ہے کہ وہ خاکوانی کا تذکرہ کرتے وقت اپنا ذکر بالکل نہ کرے اور یہ ہرگز ظاہر نہ ہونے پائے کہ وہ خاکوانی کو جانتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس پر یہ حد قائم ہو جائے گی کہ اس نے اپنے ممدوح کی شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے جو خود کو بلند کرنے کی کوشش اور ممدوح کو بطور ایک لیور کے استعمال کرنے کے مترادف ہے اشفاق احمد کی طرح مجھ سے بھی رِگرے پینٹ نہیں ہوتا جو جیسا ہے ویسا ہی ہے گوری

رنگت مجھ سے کالی نہیں ہوتی بابو گوپی ناتھ مجھ سے پھینگی نہیں بنتا ہاں! دوسری شرط سے کسی حد تک میں اگر کچھ فائدہ نہ بھی اٹھانا چاہوں تو بھی مجھے ملے گا کیونکہ بڑوں کا ذکر بھی بڑا بن جاتا ہے۔عاصم بخاری اپنے نام کی طرح ہر اخلاق رذیلہ سے مامون، محفوظ ہے اس کے اندر نہ حرص ما یہ ہے نہ حبِ جاہ ہے بلکہ بعض اوقات تو اس کی حد سے زیادہ اچھائیاں دیکھ کر اسے "ابوالبّر " کہنے کو جی کرتا ہے اوران سے ملنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی عالم بالا کی مخلوق ہے۔اب یہ بات بھی نہیں کہ میں آپ کو ان سے بیعت کرنے کے لیے قائل کر رہا ہوں ویسے نجیب الطرفین ہونے کے ناتے عوام الناس کو "رجوع الی البخاری" کر کے سادا تی فیوض وبرکات حاصل کرنے کی اجازت ارشد یہ ہے۔

برٹرینڈ رسل سے کسی نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو؟ میں چاہتا ہوں کہ میری نگاہ اللہ کی نگاہ جیسی ہو جائے نہ لاگ رہے نہ لگاؤ مگر ہم بندے ہیں ہمیں لاگ بھی ہوتا ہے اور لگاؤ بھی ہمیں لوگ اچھے بھی لگتے اور زہر بھی لگتے ہیں۔

انسانی شخصیت ایک تہہ در تہہ ڈھکا چھپا سلسلہ ہے۔ پورے طور پر اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔مگر میں جتنا عاصم بخاری کو جانتا ہوں بغیر کسی لاگ اور لگاؤ کے بیان کر رہا ہوں۔

عاصم بخاری ان دنوں سرگودھا یونیورسٹی میں ایم فل کا تھیسز لکھ رہے ہیں لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ کئی لوگوں کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تھیسز کرانے میں اہم کردار ادا کر چکے ہیں۔اردو ادب سے معمولی سی بھی شناسائی رکھنے والا کوئی بھی شخص جس کا تعلق میانوالی سے ہو وہ ان کے نام سے واقف ہے عاصم

بخاری کو خدا نے فوٹوگرافک میموری سے نوازا ہے۔ ان کو ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں۔ ان کو حافظِ تاریخ میانوالی کہیں تو بے جا نہ ہوگا حتیٰ کہ انہوں نے شعراء کا شجرہ نسب بھی یاد کر رکھا ہے۔ ان کا لہجہ مثالی اور تلفظ غضب کا ہے۔ اندازِ گفتگو اتنا جاذب ہے کہ انسان ان کے الفاظ کے سحر میں کھو جاتا ہے میں نے ایک بار ان کے کالج دور کے دوست سے پوچھا یار! یہ عاصم بخاری نے جو شائستگی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور نرمی کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے دوست اور بیوی تو انسان کے باطنی کیفیات سے واقف ہوتے ہیں۔ کہنے لگے یارا جو شخص شہد پانی میں گھول کر دو چمچ صبح اور دو چمچ رات سونے سے پہلے پئے مصری کی ڈلیوں کو ایسے چوسے جیسے بچے میٹھی گولیاں چوستے ہیں تو بھلا کیسے اس کی گفتگو میں شیرینی اور مٹھاس نہیں ہوگی۔ اب یہ بات انہوں نے ازراہِ تفنن ہی کی ہو لیکن پھر اس عمر میں شوگر کا یہ لیول کہ انسولین کی نوبت آ گئی کیا Suggest کر رہا ہے۔

ان کے چہرے کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ان کے سینے میں کیسے کیسے ارمان مچلتے ہیں اور کیسی کیسی حسرتیں اور کیسے کیسے دکھ جو اپنوں کے ستم اور غیروں کے طعنوں کے سبب ہر وقت بلائے جان بنے رہتے ہیں لیکن مجال ہے کہ چہرے پہ خفگی، اداسی اور مایوسی نظر آئے۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ارنیسٹ ہیمنگ وے کا کردار سان تیاگو یاد آ جاتا ہے جس کی آنکھوں میں ہر وقت امیدیں رقص کناں ہوتی ہیں۔

کتب بینی ان کا شغف ہے جب دیکھو کتاب میں سر دابے بیٹھے ہیں۔ ویسے اس تحقیق کی ضرورت ہے کہ کہیں وہ واش روم میں بھی اپنے ساتھ کتاب تو نہیں

لے جاتے کہ وہ لمحات بھی تحصیل علم سے محروم نہ رہ جائیں اتنا پانی پینے کے بعد بھی واش روم بہت کم ہی جاتے ہیں۔ چائے کے دیوانے ہیں کہتے ہیں ٹیچر کا مطلب ہی Tea کو چرنے والا کے ہیں میں تو انہیں چائے کا دیگچہ کہتا ہوں۔ عمر کے پانچویں عشرہ کی تکمیل کر چکے ہیں لیکن مجال جو کبھی ڈاڑھی اور سر کے بالوں کی تراش خراش میں ایک بال بھی اوپر نیچے ہو۔ ایم فل کے پہلے سمسٹر میں تو ڈاڑھی کو بھی بلا ناغہ کلر کرتے تھے۔ لیکن تمام لڑکیوں کے عاصم بھائی کہنے اور ایک لڑکی کے عاصم انکل کہنے کے بعد عاصم بخاری ہماری توجہ دلانے کے باوجود بھی کلر نہیں کرتے تھے۔ بھائی اور انکل کے بعد کلر کرنے کا کوئی ''تک'' ہی نہیں بنتا۔

میرے کال پیکج کا سب سے بڑا مصرف عاصم بخاری ہی ہیں۔ ویسے ان کے نام پہ پیکج لگا کر دو چار لڑکیوں سے بات کر بھی لی جائے تو بیگم صاحبہ کو دغا دیا جا سکتا ہے۔ ہاں ایک بار میری بیگم نے اپنے اس خدشہ کا اظہار بھی کر دیا کہتی ہیں کہ سرتاج! کہیں آپ نے عاصم بخاری کے نام پر کسی لڑکی کا نمبر تو Save نہیں کر رکھا وہ میری خوش بختی عروج پر تھی کہ اس وقت inbox میں عاصم بخاری کے اظہار تخاطب کا بڑا ''سلوگن'' جی ارشد بھائی والا میسج موجود تھا جس سے میری جان خلاصی ہو گئی۔

ان کی شاعری حالی نظر آیا تنقید پڑھی تو حالی نظر آیا۔ ساتھ سفر کیا تو حالی نظر آیا۔ گھر کے معاملات پر نظر ڈالی تو حالی نظر آیا۔ شرافت ان کا لباس ہے اور اسی کو وہ زادِ راہ سمجھتے ہیں۔

ہیلین کیلر نے کہا تھا ''جو موت کے سایے میں رہتے ہیں وہ ہر اس چیز میں ہلکی سی مٹھاس لے آتے ہیں جو وہ کرتے ہیں'' اللہ ان کی عمر دراز کرے مجھے لگتا ہے

جیسے وہ بھی مسلسل کسی انجانے خوف کے سایے میں زندگی گزار رہے ہیں۔

جتنا وہ کام کررہے ہیں۔وہ کم از کم مقداری لحاظ سے سراہے جانے کے قابل ہے۔ ان کے اوقاتِ کار کو دیکھ کر اسلاف کی یاد آجاتی ہے۔جن کے لیے مصروفیت ہی بڑی فرصت ہوتی تھی۔

18 کتابیں شائع کرا چکے ہیں دو کتابیں طباعت کی منتظر ہیں۔ رسائل و جرائد میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔ خاندان،ملازمت اور وسیع حلقہ احباب کو Manage کرنا انہی کا خاصہ ہے کوئی اصلاح لینے آرہا ہے کوئی اپنی کتاب پر تبصرہ لکھوانے آرہا ہے۔کوئی چارٹ بنوانے آرہا ہے تو کسی کو تقریر کی حاجت ہے ایسا Stamina خدا صرف ان کو عطا کرتا ہے جو اس عطا کے مستحق ہوتے ہیں اور اشفاق احمد کی زبان میں خدا کی مخلوق کے لیے آسانیاں تقسیم کرتے ہیں۔پچھلے چند برسوں میں میری ہر کامیابی میں میرے ہمسفر رہے ہیں۔عورتوں کے حقوق کے بہت بڑے علمبردار ہیں اور اگر عاصمہ جہانگیر کو پتہ چل جاتا تو ضرور ان کو کوئی نہ کوئی ایوارڈ دلواتیں یقین نہیں آتا تو ان کی کتاب "ظلم عورت پے" پڑھ لیجئے آپ پر کھلے گا کہ وہ پکے Feminest ہیں۔جو لوگ عاصم بخاری کی شخصیت کو تار تار کرنے کی کوشش میں لگے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بانسری میں چھید کیے بھی اس لیے جاتے ہیں کہ سر پیدا ہوں۔اور انہی لوگوں کے دیے ہوئے زخم ان کی شاعری کو پر درد اور پر تاثیر بنا رہے ہیں۔عاصم بخاری کے فن میں آپکو آرنلڈ کی High Seriousness اور ارسطو کا بیان کردہ مزاحیہ تڑکا ساتھ ساتھ ملیں گے۔

Uripides نے کہا تھا کہ عشق انسان کو شاعر بنا دیتا ہے خواہ اس میں

شاعرانہ صلاحتیں نہ بھی ہوں۔اغلب ہے کہ بخاری صاحب کو بھی جوانی میں کسی شوخ کی حشر سامانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا یا پھر بیگم سے (عشقِ حقیقی) ہے جوان کی شاعری میں کسک بن کر بین السطور دھڑکتا رہتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ ان کا جنم کٹر شیعہ خاندان میں ہوا اور شیعہ خاندان کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ (بقول ممتاز مفتی) آنکھ کھلتے ہی روایت ہے۔کلام ہوتا ہے ردھم ہوتا ہے لے ہوتی ہے۔جذبہ ہوتا ہے۔اور میر انیس ہوتا ہے۔

شریک حیات

شادی کے ان آٹھ سالوں میں شاید ہی کوئی ایسا دن آیا ہو جب ہم لڑے نہ ہوں۔ نہ ہی کوئی ایسا لمحہ آیا جب ہم نے کسی بات پر اتفاق رائے پایا ہو۔ نہ ہی خدا نے کوئی ایسی چیز پیدا کی ہے جو ہم دونوں کو مشترکہ پسند ہو۔ اسے نیند پسند ہے میں Night Owl اسے رات پسند مجھے دن کے اجالے اسے واش روم سے خوف آتا مجھے نہانا پسند، اسے خاموشی پسند میں بلا کا باتونی، وہ سر کے نیچے کچھ نہیں رکھتی میں دو سرہانوں کا عادی، اسے نیٹ پسند مجھے بکس، میں شوخ وہ شرمیلی، الغرض یہ فہرست بہت طویل ہے۔

اسے مجھ سے محبت نہیں مگر مجھے کہیں جانا ہو تو اس کا موڈ آف ہو جاتا ہے، اس نے کبھی بچوں کو تو نہیں سنبھالا کہ میں مطالعہ کر سکوں مگر امتحان میں میرے لیے دعائیہ سٹیٹس ضرور لگاتی ہے۔ اسے میری عادتیں پسند ہیں یا نہیں مگر کپڑے وہ میری پسند کے ہی لیتی ہے، پتہ نہیں وہ میری ماں کی تکریم کرتی ہے یا نہیں البتہ ایک دو دن امی کے گھر نہ جاؤں تو مجھے کہتی ہے ماں سے مل آؤ، مجھ سے لڑنا اس نے نہیں چھوڑا اگر مجھ سے لڑنے کے بعد میرے لیے کوئی نہ کوئی میری پسند کی چیز منگوا لیتی ہے، اسے ٹھنڈا پانی پسند تھا اب بھی پیتی ہے مگر اپنے لیے فریج میں الگ برتن رکھ لیتی ہے، وہ کپل شو اب بھی دیکھتی ہے مگر LED پر نہیں موبائل سکرین پر، وہ میرے لیے صبح جلدی اٹھ کے ناشتہ نہیں بنا سکتی مگر میرے بغیر ناشتہ کرتی بھی نہیں (Pregnancy کی بات

الگ ہے)، وہ فطرتاً سست مزاج ہے مگر کبھی میرے گھر میں وہ الیکٹریشن بنی ہوتی کبھی میسن، اس نے تعلیم میں مجھے کبھی سپورٹ نہیں کیا مگر بچوں کی ضروریات کے لیے کچھ مانگا بھی نہیں، وہ بار بار میرا موبائل چوری چھپے دیکھتی ہے اسے مجھ پر شک ہے مگر وہ مجھے کھونا بھی تو نہیں چاہتی، وہ میرے غلط رویوں پر مجھ سے بدتمیزی کرتی ہے شاید اس لیے بھی کہ مجھ میں بہتری کی گنجائش ہے، اس نے کام سے بچنے کے لیے آیا رکھی ہوئی ہے مگر اس کے ناخن کیوں خراب ہو رہے ہیں، میری طرح اس نے اس گھر کے لیے کوئی Solid قربانی نہیں دی مگر تین Pregnancies میں HB چھ پہ پہنچ گئی تھی، میرا خیال تھا کہ وہ میرا خیال نہیں رکھتی مگر میرا وزن 56 سے 76 ہو گیا اور اس کی رنگت سرخ سے زرد کیوں ہو گئی، مجھے یاد نہیں کبھی اس نے مجھے بوسٹ آپ کیا ہو ہاں ایک بار اتنا کہا تھا ارشد Humanity کے لیے کچھ کرنا۔ اس کو میرے کتب بینی سے مسئلہ ہے مگر شاید وہ سمجھتی ہے کہ اس کے حصے کا وقت خرچ ہو رہا، مجھے اس کا ساتھ اتنا اچھا نہیں لگتا مگر جب بھی وہ میکے جاتی ہے میں اداس ہو جاتا ہوں، مجھے یاد ہے ایک بار میں کچھ اس سے زیادہ ہی خفا ہو گیا تھا وہ روتی روتی سو گئی، خواب میں آقا ملے ان سے بھی عرض کرنے لگی ارشد کو سمجھائیں نا۔۔۔ میں نے اسے اردو انگریزی کے تلفظ سکھائے یقین مانوں اس نے مجھے پہننا اور برتنا سکھایا، اور ہاں 2014 تک میں نے کبھی ناشتہ نہیں کیا تھا اس نے مجھے ناشتے کا عادی بنا دیا ہے اور ہاں نہ مجھے اس سے محبت ہے نہ وہ میری چاہت ہے ہاں اس نے ناشتے کی طرح خود کو بھی میری عادت بنا ڈلا ہے وہ میری عادت بن چکی ہے اور فاروق اعظم نے کہا تھا عادت کبھی نہیں بدلتی۔

CHIRAGH-E-FIKR

by

Mian Muhammad Arshad Hassan

دیگر کئی اصناف شعر و ادب کی طرح مضمون نگاری کا آغاز بھی تحریک علی گڑھ سے ہوا۔کسی مخصوص اور متعین موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات واحساسات کا تحریری انداز میں اظہار ''مضمون'' کہلاتا ہے۔اس نثری صنف کو عام طور پر بیانیہ تحریر کہا جاتا تھا۔اگرچہ عہد حاضر میں کہیں کہیں ''علامتی'' پیرائیہ'' بھی اختیار کیا جاتا ہے۔اس صنف میں ہر طرح کے موضوعات بیان ہوتے ہیں۔اس تناظر میں میاں محمد ارشد حسان کی زیر نظر کتاب ''چراغ فکر'' متنوع موضوعات کی ایک تابندہ مثال ہے۔اس کتاب میں تحقیق وتنقید کے ہمراہ طنز و مزاح اور خاکے کی اصناف بھی جگمگا رہی ہیں۔اس طرح یہ کتاب تخلیقی اور غیر تخلیقی تحریروں کا دلکش مرقع ہے۔صاحب کتاب ایک فقیر منش اور کثیر المطالعہ لکھاری ہیں جن کا اسلوب تحقیقی ،تنقیدی ،تجزیاتی اور منطقی ہے اور ان کی لکھتوں کا غالب مزاج برجستہ اور رواں ہے۔ان کے مضامین ،طنز و مزاح اور خاکوں کے عنوانات منفرد اور اچھوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔زیر نظر کتاب میں پیش کی گئیں تحریریں اپنے مواد ،اسالیب اور لفظیات کے پس منظر میں باکمال ہیں جو میاں صاحب کے بڑے تحقیقی وتنقیدی امکانات کی خبر دے رہی ہیں۔ان کا انداز تحریر کہیں کہیں تقابلی رخ بھی اختیار کر لیتا ہے جو یقینی طور پر معاصر اردو تحقیق ،تنقید اور طنز و مزاح میں نئے رویوں کو متعارف کرا رہا ہے یقیناً یہی طرز اسلوب آگے جا کر انہیں انفرادیت بخشے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج لیہ

ایم۔ارسلان پبلیشرز

ملتان - فیصل آباد - لاہور

0306-5109344